لندن سے شائع ہونے والا میدانِ ادب کا واحد کثیر الاشاعت بین الاقوامی اردو میگزین
लंदन से सबसे अधिक प्रकाशित होने वाला उर्दू अदका मात्र अंतरराष्ट्रीय मैगज़ीन
An International Literary Urdu Magazine Globally Circulated

ماہنامہ قندیل ادب انٹرنیشنل لندن

شمارہ:116 اگست 2022ء

QINDEEL-E-ADUB INTERNATIONAL

103 Peterborough Road Carshalton SM5 1EE London
(M) 0044-7886-304637 (R) 02086482560
www.qindeel-e-adub.co.uk, ranarazzaq52@gmail.com

سلطان صابری کی کتاب ''روح کی زندگی'' کی رَسمِ اَجراء اور مشاعرہ (رپورٹ صفحہ 15 پر ملاحظہ فرمائیں)

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن برطانیہ کی ادبی نشست (رپورٹ صفحہ 14 پر ملاحظہ فرمائیں)

Earlsfield Properties

Professional Residential Property Management Services

We will manage your property at 0% commission
Guaranteed
Rent Schemes for 3 & 5 years.

Free Management Services
Guaranteed Vacant Possession.

Get it Right

- Member National Landlord Association
- Member Deposit Portection Schemes
- Member The Property Ombudsman Scheme
- Winner of Pakistan Achievement Award 2014 (Excellence Management)
- Vastly Experience in Housing Benefits Clients.

PLEASE CONTACT: NAVEED SARWAR (MA EUROPEAN REAL ESTATE)

175 Merton Road, London SW18 5EF

Tel: 02082656000 02088770762
Fax: 02088749754
Email: info@earlsfieldproperties.com
Web: www.earlsfieldproperties.com

مجلس ادارت

بانی اراکین

خان بشیر احمد رفیق مرحوم

آدم چغتائی مرحوم

مدیر

رانا عبد الرزاق خان

نائب مدیر: مبشر شہزاد، گلاسگو

اراکین ادارتی بورڈ

ڈاکٹر منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید۔ امجد مرزا امجد، طارق مرزا آسٹریلیا، عبد القدیر کوکب، بشارت احمد چیمہ۔

التماس

تمام دوستوں سے التماس ہے کہ اپنی شعری و نثری تخلیقات اور ادبی پروگرامز کی رپورٹیں وغیرہ برائے اشاعت بصورت ''اِن پیج اردو'' فائلز مع تصاویر ای میل سے روانہ فرمائیں۔ ''قندیل ادب انٹرنیشنل'' بیسیوں ممالک میں لاکھوں اردو قارئین کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ میگزین کے مندرجات پر آپ کی رائے یا مختصر تبصرے ہمیں اپنا محاسبہ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ مضامین کے ساتھ ضروری حوالہ جات آپ کے مضامین کی افادیت کو بڑھاتے ہیں۔ آپ کی بھیجی ہوئی تمام تصاویر وغیرہ ''کاپی رائٹ فری'' ہونی چاہئیں۔ شکریہ

IMPORTANT ANNOUNCEMENT

"Qindeel-e-Adab International" magazine is a non-commercial and non-profit e-product, as well as on paper, internationally distributed free of cost for the promotion of bi-lingual poetry, fiction, informative multi purpose interesting articles etc in Urdu alphabet in the UK and Europe under the sole ownership of its Chief Editor Abdul Razzaq Khan of the address as stated elsewhere within this magazine for delivery of documents.

The magazine and the contents herein DO NOT relate to a political, religious or a social group whatsoever. The Editor does not necessarily agree with the opinions expressed by the article writers, poets etc..

Although the e-magazine is FREE OF COST to all, yet for ON PAPER copies of the magazine we do expect a reasonable amount of donation to cover the costs of printing, postage and packing for all countries as stated

Chief Editor

فہرست مضامین

غزلیات: ڈاکٹر شبنم کرناٹک، ڈاکٹر فرزانہ فرحت، طارق انور باجوہ، قتیل شفائی، انجم جاوید، گل بخشالوی، نجمہ محبوب نجمہ، رویندر کور بھاٹیہ، آفتاب شاہ، افتخار راغب، بقا بلوچ، ظریف احسن، راجہ اسلم نارمہ کشمیر، شفیق مراد جرمنی، ممتاز ملک، ایم زیڈ کنول، ڈاکٹر رحمان دانش، ڈاکٹر محمد اشرف کمال، ساحل سلہری، اسد رضوی، منیر باجوہ، منور احمد کنڈے، معاذ ہاشمی، تبسم نواز وڑائچ، عبد الشکور کلیولینڈ، اطہر حفیظ فراز، امین اوڈیرائی، عبد الکریم خالد، عبد الجلیل عباد، ارشد حمزہ سادوکی، فرخندہ رضوی، ابرار احمد، افتخار شاہد ابوسعد، صابر ظفر، طاہر مجید، ناصر جمیل، مبارک عابد، احمد منیب، احکم غازی پوری، اختر حسین چمیہ، مسعود چوہدری، احمد مبارک، جمیل الرحمن۔		4 تا 14
تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن برطانیہ	ادارہ	14
سلطان صابری کی کتاب روح کی زندگی رسم اجراء	ادارہ	15
کتاب روح کی زندگی	تبصرہ: رانا عبد الرزاق خان	16
جبیں نازاں کا مضمون	ادارہ	17
نثر اور نظم میں فرق اور نظم کی اقسام	شمسہ نجم	19
پاکستان کی تاریخ کے وہ اوراق	رجل خوشاب	21
تذکرہ و تانیث	ابن لطیف	22
آفتاب شاہ		22
یہ دنیا ایک امتحان ہے	عاصی صحرائی	24
تاریخ کے اوراق سے	عاصی صحرائی	26
افسانہ۔ بھیگی پلکیں	سجاد انعام سہارن	27
گلزار بحیثیت افسانہ نگار	ڈاکٹر محمد زاہد کلکتہ۔ انڈیا	29
آسمان صحافت کا ستارہ	عارف نقوی	31
پاکستان واپس آنے والی بدقسمت لڑکیاں	یاسر پیرزادہ	32
عقلمندی کا شاہکار دلچسپ عربی حکایت	رانا عبد الغفور	33
تمثیلی افسانہ مایوسی	اسماء صبا خواج لکھیم پور کھیری	35
وزارت انتظامی امور برائے گھڑا وزیر تعلیم	عاصی صحرائی	36
اردو ڈائجسٹ۔ ایڈیٹر مجیب الرحمن شامی	کھوٹا سکہ	37
جستہ جستہ	عطاء القادر طاہر	38
نشور واحدی کی سحر آفریں لے	جاوید اختر علی آبادی	39

اعلان

ماہانہ قندیل ادب انٹرنیشنل میگزین کا سالانہ چندہ 25 برطانوی پونڈ ہے۔ اگر کسی کو گھر پر بذریعہ ڈاک ارسال کرنا پڑے تو 35 پونڈ سالانہ ہے۔

نیچے دیئے گئے اکاؤنٹ میں سالانہ چندہ کی ادائیگی فرمائیں۔ جزاکم اللہ

رانا عبد الرزاق خان لندن

HSBC London UK,

A/C 04726979 Sort Code 400500

(M) 0044-788-304637 (R) 02086482560

غزلیات

ذاکرہ شبنم، کرناٹک

عکس سے ایک حقیقت میں بدلنے کیلئے
حوصلہ چاہئے درپن سے نکلنے کیلئے
پتھروں سے کوئی چلتا رہے بچ کر کب تک
ٹھوکریں کھانا ضروری ہے سنبھلنے کیلئے
ہم کو معلوم نہیں مرتا ہے کتنا ہم پر
دعویٰ کافی ہے مگر اُسکے بہلنے کیلئے
چھاؤں پیپل کی گھنی گاؤں کی یاد آئی ہمیں
شہر کی دھوپ میں جب نکلے ہیں جلنے کیلئے
ہاتھ دھونا نہ حقیقت سے کہیں پڑ جاؤ
تم جو بیتاب ہوا فسانوں میں ڈھلنے کیلئے
تھام لے گا نہیں گرنے مجھے دے گا شبنم
میں ہوں بیتاب بہت گرچہ پھسلنے کیلئے...!!

ڈاکٹر فرزانہ فرحت

گزر گیا جو دکھوں کا موسم تو حسرتیں کیا شمار کرنا
ملا مسیحا، ملا ہے مرہم، قیامتیں کیا شمار کرنا
غموں کی وحشت سے گھبرا کے جام کل رات اک پیا تھا
فسوں کی حالت گزر گئی ہے تو وحشتیں کیا شمار کرنا
جو سجدوں میں رات کاٹی تو جھولی پھولوں سے بھر گئی تھی
نکل گئے ہیں جو خار دل سے ریاضتیں کیا شمار کرنا
مری نگاہوں میں بس گئے ہیں محبتوں کے حسین سپنے
جو میں نے دیکھیں ہیں زندگی بھر قیامتیں کیا شمار کرنا
میں کس طرح سے تمہیں بتاؤں کہ زندگی بھر کتابِ دل پر
لہو سے لکھے ہیں نام کتنے شہادتیں کیا شمار کرنا
مرا تھا کوئی جو ایک دشمن اسی کا دل میرا گھرا ہوا ہے
محبتوں کے مکان میں پھر عداوتیں کیا شمار کرنا
سفر کا کوئی حساب رکھا نہ کھول کر غم کا باب رکھا
گئے دنوں کی مسافتوں کی اذیتیں کیا شمار کرنا
ملا ہے مجھ کو بھی ہم سفر اب، کھلا ہے اب پھول میرے دل کا
مصائب آ کر گزر گئے ہیں مصیبتیں کیا شمار کرنا
تمہارے دل کے مکاں میں فرحتؔ جو چاہتوں کا ہوا اجالا
تو ظلمتوں کا حساب کیسا کدورتیں کیا شمار کرنا

طارق انور باجوہ

یہ دیکھا جائے گا، کیا کیا عمل، کتاب پہ ہے
تو ہو گا سرخرو، جس کی نظر حساب پہ ہے
حسیب ہے وہ، مگر ہے بڑا رحیم و کریم
نظر ہے نعمتوں پر، کب مری عذاب پہ ہے
سرور روح کا پاؤ، یا اول فول بکو
چڑھے گا کیسا نشہ، منحصر شراب پہ ہے
نہیں ہے شک و شبہ، تشنگی سے ہو گی موت
مدارِ زندگی، صحرا میں گر، سراب پہ ہے
ہے اُس کا حُسنِ بیاں، حُسن سے ذرا بڑھ کر
اُٹھوں میں کیسے کہ محفل ابھی شباب پہ ہے
کریں گے دوستی ہم سے یا دشمنی ہو گی
یہ ہم نے فیصلہ چھوڑا فقط جناب پہ ہے
سنا ہے، ہوتی ہیں مضطر کی سب دعائیں قبول
ہو اضطرار مگر، یہ بھی اضطراب پہ ہے
وہ سائبان بنے، سر پہ گو رہیں طارقؔ
برس بھی جائیں، کہاں فیصلہ سحاب پہ ہے

وصل میں خاص جو قدرت نے مزہ رکھا ہے
ہجر میں درد بھی تو، اس سے سوا رکھا ہے
کوئی بھولے تو کبھی یاد بھی آئے اس کی
کیسے بھولیں گے جسے دل میں بٹھا رکھا ہے
روشنی اُس سے، ہَوا، سانس کا ساماں، اُس سے
روزنِ خانہ دل ہم نے کُھلا رکھا ہے
عشق میں جینا ہے آسان، نہ مرنا مشکل
نام عشّاق نے یوں اِس کا سزا رکھا ہے
عشق اور مشک چھپائے سے نہیں چھپ سکتے
اِس کی خوشبو کا تو سب ہی نے پتا رکھا ہے
کوئی اچھا ہی نہیں لگتا ہمیں اُس کے سوا
ہم نے یہ راز تو اُس سے بھی چھپا رکھا ہے
رونقِ بزم ہو یا دشت کی تنہائی ہو
ساز نغموں پہ وہی ایک بجا رکھا ہے
ایک ہم ہی تو نہیں اُس کے پرستار یہاں
اُس نے ہر ایک کو دیوانہ بنا رکھا ہے
فکر کب باقی رہی جب سے ملا وہ طارقؔ
ہم نے دل، جان فقط اس پہ لُٹا رکھا ہے

رات کے بعد، کب سحر نہ ہوئی؟
کیسے کہتے ہیں وہ خبر نہ ہوئی
لاکھ دیکھیں نشانیاں لیکن
کوئی بھی ان کو معتبر نہ ہوئی
دیکھ کر بھی شہادتیں اتنی
دل جو پتھر تھے، آنکھ تر نہ ہوئی
بھول بیٹھے ہیں دل سے نکلے جو

وہ کبھی آہ بے اثر نہ ہوئی
ساتھ تقدیر نے جو چھوڑ دیا
''کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی''
اک انا راستے میں حائل تھی
ایک چوٹی بھی ان سے، سر نہ ہوئی
صاف دل ہو کے جب نہیں دیکھا
عقل پھر صاحبِ نظر نہ ہوئی
بدگمانی نے کھینچ دی دیوار
یوں ملاقات عمر بھر نہ ہوئی
طعنوں تشنوں سے کام لیتے ہیں
کوئی بات ان سے بے ضرر نہ ہوئی
ہے تعجب مگر کہ کیوں اُن کے
حق میں تقدیرِ خیر و شر نہ ہوئی
کاش ہوش و خرد سے لیتے کام
اس کی توفیق بھی، مگر نہ ہوئی
عشق منزل کو لے چلا طارق
عقل جب عازمِ سفر نہ ہوئی

قتیل شفائی

وِعدۂ حور پہ بہلائے ہوئے لوگ ہیں ہم
خاک بولیں گے کہ دفنائے ہوئے لوگ ہیں ہم
یوں ہر ایک ظلم پہ دم سادھے کھڑے ہیں
جیسے دیوار میں چنوائے ہوئے لوگ ہیں ہم
اس کی ہر بات پہ لبیک بھلا کیوں نہ کہیں
زر کی جھنکار پہ بلوائے ہوئے لوگ ہیں ہم
جس کا جی چاہے وہ انگلی پہ نچا لیتا ہے
جیسے بازار سے منگوائے ہوئے لوگ ہیں ہم
ہنسی آئے بھی تو ہنستے ہوئے ڈر لگتا ہے
زندگی یوں تیرے زخمائے ہوئے لوگ ہیں ہم
آسمان اپنا، زمیں اپنی، نہ سانس اپنی تو پھر
جانے کس بات پہ اترائے ہوئے لوگ ہیں ہم
جس طرح چاہے بنالے ہمیں وقت قتیلؔ
درد کی آنچ پہ پگھلائے ہوئے لوگ ہیں ہم

انجم جاوید

وسعت آسماں نہیں معلوم
کھو گیا دل کہاں نہیں معلوم
کیسے کھولوں جہاں کی گتھی کو
مجھ کو رمز جہاں نہیں معلوم
کیسے نکلوں حصار اُلفت سے
راستہ ہے کہاں نہیں معلوم
مسکراہٹ تو ہے لبوں پہ مگر
ہے ہنسی یا فغاں نہیں معلوم
رکھ دیئے ہونٹ اس نے ہونٹوں پر
پھر ہوا کیا میاں نہیں معلوم
ایسا لگتا ہے تم مرے ہو مگر
ہے یقیں یا گماں نہیں معلوم
اک اداسی سی دل پہ طاری ہے
جائے گی کب خزاں نہیں معلوم
ہوں میں انجمؔ حساب میں کمزور
مجھ کو سود و زیاں نہیں معلوم

گل بخشالوی

مرے وطن کے عظیم لشکر، میں کیوں
نہ کہہ دوں
کہ ہم نے سونپی ہے ذمہ داری وطن کے اندر وطن کے
باہر خیال رکھنا ہے سرحدوں کا!
کمالِ جرات سے تم نے اپنی قسم نبھائی نبھا رہے ہو
وطن کے اندر، وطن سے باہر، وطن کی سرحد
تمہارے جذبوں، تمہارے قدموں
تمہاری جرأت کی داستاں ہیں
شہید تم ہو، تمہی ہو غازی، گلاب تم ہو
تمہارے جسموں سے جب بھی گرتے ہیں
خون کے قطرے
بدن تمہارے گلاب جیسے، گریں کبھی تو
حسین دھرتی کے ذرے سلام کرتے ہیں گیت گا کر
جہانِ عظمت میں سر اُٹھا کر، نشانِ حیدر تمہیں عطا کر،
عظیم دھرتی بدن میں اپنے تمہیں سجا کر،
تمہاری عظمت، تمہاری شوکت پہ ناز کرتی
سوال تم سے وہ پوچھتی ہے
عدو ہی میرے وطن کے گلشن میں حکمراں ہے،
ہوا تعلق یہ کہہ رہے ہو امیر لشکر
تم اپنی وردی،
تم اپنے تمغوں کا کیا کرو گے میں سوچتا ہوں!
چلے ہی جانا ہے تم نے آخر تو اس جہاں سے
مرے خدا کو جواب دینا ہے تم نے سوچو!!
صلہ یہ کیسا دیا ہے تو نے
مری محبت، مرے پسینے، مرے لہو کا

نجمہ محبوب نجمہ

سخن کی جستجو تم ہو غزل کا بانکپن تم ہو
مری محفل بھی تم ہی تم ہو میری انجمن تم ہو
نہ میرا دل رہا میرا نہ میری روح میری ہے
مرے مختار و مالک تو بس اب اے جانِ من تم ہو
تمہاری سلطنت ہے یہ تخیل کی حسیں دنیا
میں اک ادنیٰ سی باندی ہوں شہنشاہِ سخن تم ہو
تمہی ہو مہرِ علم تاب تم ہی ماہِ کامل ہو
تمہی خوشبو ہوا ہے ہمدم مرے برگ و سمن تم ہو
تمہیں کس کا جنوں ہے اس سے کچھ مطلب نہیں مجھ کو

مجھے اتنا پتہ بس میرا دیوانہ پن تم ہو
یہی سچ ہے کہ نجمہ کی اندھیری زندگانی میں
حیات افزا سی اک امید کی روشن کرن تم ہو

رویندر کور بھاٹیہ

یہ سوچ کے بہت دور وہ منزل کا نشاں ہے
زخمی ہے بدن پھر بھی میرا عزم جواں ہے
شہروں کی فضاؤں میں بھی رکھتا ہے مرے لفظ
صحرا کی زمیں پر بھی رقم میری زباں ہے
اُترو تو کبھی اس میں میری آنکھ کے رستے
قدرت کا کرشمہ ہے یہ دل حسنِ جہاں ہے
آ پھر سے ملیں اس کی گلی میں زخم سجا کے
جو راحتِ دل رُوح بدن محورِ جاں ہے
اک یاس کا صحرا ہے کہ پھیلا ہوا ہر سُو
اک آس کا دریا ہے کہ ہر طرف رواں ہے
جس دیس کی تاریخ لکھی خون سے ہم نے
سنتے ہیں کہ وہ دیس گلابوں کا جہاں ہے
کس طرح یقیں اوڑھ کے سوچے تجھے روئی
بیٹھی ہے ترے پاس مگر پھر بھی کہاں ہے

آفتاب شاہ

گداز تکیہ تمہاری بانہیں نشیلی آنکھیں لسانِ قدرت
خطوطِ شب کے لٹیں ہیں تیری بدن کی خوشبو زبانِ قدرت
قدم اٹھانا غضب قیامت، کمر کا حلقہ مقامِ حیرت
صراحی گردن سوالِ رفعت وجود رقصاں اڑانِ قدرت
جمال تیرا کرشمہ رب کا حسین رنگت عطائے فطرت
لبوں کی لالی گلاب جیسی بھنور ذقن کا مکان قدرت
کتاب چہرہ گلال چہرہ لبوں کے کونوں پہ خال پہرہ
اٹھان شعلہ اٹھان فتنہ بدن کی حدت اٹھانِ قدرت
کمان پلکیں، ہلال ابرو، فریب نظریں، مثال نیناں
سلیم فطرت، متین عادت چمکتا ماتھا نشانِ قدرت

آفتاب شاہ

نہ مجھ کو چین آوے ہے نہ مجھ کو نیند ہی آوے
سجن کی دے خبر کوئی کوئی تو اس طرف جاوے
جلن رہتی ہے سینے میں اسے کہہ دو صدا دے
کوئی تو یار کے کوچے سے تھوڑی دلبری لاوے
یہ دل کا ہے کو تیری یاد میں جل جل کے دھڑکے ہے
یہ کاہے نام لے تیرا یہ کیونکر روگ ہے کھاوے
بتاؤں کیا میں لوگوں کو ترے دیکھے سے کیا ہووے
جو تجھ کو دیکھ لے یارو وہ جنت کا مزہ پاوے
سجن کی بھولی باتاں سے گماں ہووے ہے کوئل کا
سجن کی بھوری اکھیاں میں پپیہا گیت ہے گاوے
ملن کی بات کرنے پر حیا مکھڑے کو کھا جائے
سمٹتی جائے لاجاں سے دِلاں پر برق ہے ڈھاوے
ترے ہنسنے پہ دل اپنا تری جانب کھچا جاوے
ترے رونے پہ دل تڑپے عجب سی تشنگی چھاوے
تری سوچاں کی بھنوراں میں کوئی رستہ نہیں ملتا
سفر یہ بوجھ لاگے ہے محبت خون ہے تاوے
تُو سنگت ہے بہاروں کی دلاں کے چاند تاروں کی
تو رانی ہے مرے دل کی نہ دل کو اب کوئی بھاوے

افتخار راغبؔ

تیری ہر آن انوکھی ہے کسی آن میں آ
عکسِ صد رنگ لیے دیدہ حیران میں آ
اب کسی کام میں کیا خاک لگے دھیان مرا
آ کسی وقت بھی، ہر آن تو مت دھیان میں آ
کر دے مسمار نہ سب کچھ ترا دیوانہ پن
خول سے ضد کے نکل، ہوش کے ایوان میں آ
اِس سے پہلے کہ چمتکار مٹا دے سب کچھ
ایسا کچھ پھینک کہ بھگتوں کی بھی پہچان میں آ
پھر سے اے فصلِ اماں تیری ضرورت ہے بہت
خواہشِ دل سے نکل، حلقہ امکان میں آ
نور سے حسن کے تیرے، ہے تخیل پُرنور
پیکرِ شعر میں ڈھل، آ مرے دیوان میں آ
کسل مندی کا تقاضا ہے شبستان میں رہ
سبزگی ڈوب کے کہتی ہے کبھی لان میں آ
چاہتا ہوں کہ مرا دل ہو مرمّت پہلے
کیسے دعوت دوں تجھے خانہ ویران میں آ
ناخدا کون ہے راغبؔ اُسے معلوم نہ تھا
میری کشتی سے وہ کہتا تھا کہ طوفان میں آ

بقا بلوچ

مجھے دینے لگے آزار دیکھو
یہ میرے جبہ و دستار دیکھو
کسی یوسف کو لایا جا رہا ہے
ذرا یہ گرمیِ بازار دیکھو
میری حالت سے تم کو کیا غرض ہے
مجھے سمجھو میرا کردار دیکھو
یہ کیا تم اپنا چہرہ دیکھتے ہو
کبھی تو آئنے کے پار دیکھو
کسی نے بانٹ رکھا ہے مجھے بھی
میرے اندر کھڑی دیوار دیکھو
تمھیں بھی تو محبت ہو گئی ہے
زرا اپنے لب و رخسار دیکھو
مجھے تم کیا ملے ہو جانِ جاناں !
مرا ہونے لگا پرچار دیکھو
مجھے دے کر تسلی رو پڑا ہے
ارے لوگو مرا غم خوار دیکھو

ظریف احسن

خوش بیانی کی زباں ہم شام واپس آئیں گے
منتظر ہے آشیاں ہم شام واپس آئیں گے
اپنی اپنی خواہشوں کے قیدیوں نے یہ کہا
دیکھنا اے آسماں ہم شام واپس آئیں گے
دانہ دنکا چگتے چگتے کچھ ادھر ہیں کچھ اُدھر
بستیاں ہیں شادماں ہم شام واپس آئیں گے
ننھے مُنے کچھ پرندے گھونسلے سے اُڑ گئے
حوصلہ ان کا جواں ہم شام واپس آئیں گے
اپنے اپنے راستے ملتے رہے سب کو ظریف
اس لئے سب کو گماں ہم شام واپس آئیں گے

❁

دیئے کی لو بڑھانے کا تقا ضا کون کرتا ہے
ہوا سے جنگ کرنے کا تقاضا کون کرتا ہے
ازل سے دل گرفتہ لوگ محفل سے گریزاں ہیں
انہیں دل کو لگانے کا تقاضا کون کرتا ہے
ہماری آنکھ کی خلوت ہمیں آباد رکھتی ہے
ہمیں پھر سے رُلانیکا تقا ضا کون کرتا ہے

راجہ اسلم نارمہ، کشمیر

تصویر گاتی رہی رات بھر
نغمے سناتی رہی رات بھر
وجدان سے میرے احساس تک
آواز آتی رہی رات رات بھر
خوابوں میں گھلتی رہی چاندنی
دل دکھاتی رہی رات بھر
دور تاریکیوں میں سمٹتی سی لو خود سے
دامن چھڑاتی رہی رات بھر
میرے احساس کی چاندنی آب پر
نقش اپنے بناتی رہی رات بھر
صبح آئی اندھیروں کے لشکر لئے
روشنی سرسراتی رہی رات بھر

ساجن کی خوشبو

وادی میں گھنے پیڑوں کے تلے
سبزے کی ملائم چادر ہو
اور اس پر تھرکتی شبنم ہو
خوشبو کا اُجالا پھیلائے
پھولوں کے دمکتے بادل ہوں
ہر سمت اڈتے بادل ہوں
اور شام کا رنگیں منظر ہو
جب جوبن پر ہو حسنِ چمن
یہ رنگِ چمن بھی کمتر ہے
میرے ساجن کی خوشبوں سے
جو میں نے پیار میں پائی ہیں

(عربی شاعراعشی سے ماخوذ)

شفیق مراد جرمنی

اس کی بے چارگی بھلی نہ لگی
اس قدر سادگی بھلی نہ لگی
روز ملنا بلائے جاں ٹھہرا
مجھ کو یہ دل لگی بھلی نہ لگی
کچھ مزاجوں کا سلسلہ ہوتا
اتنی شائستگی بھلی نہ لگی
میری غزلوں سے جو جھلکتی تھی
اس کو یہ پختگی بھلی نہ لگی
چاہتوں کے حصار میں رکھا
مجھ کو یہ زندگی بھلی نہ لگی
مجھ پہ قربان ہو گیا یونہی
اتنی وارفتگی بھلی نہ لگی

❁

درد میں ڈوبی ہوئی اک داستاں کا اِقتباس
اس کے چہرے پر لکھا ہے کس جہاں کا اقتباس
خود ہی آجانا دریچہ درد کا تم کھول کر
خود ہی لکھنا صفحہ، دل پر زباں کا اِقتباس
ہجرتوں میں ہجر کا ساماں ہوا جب وہ ملا
نارسائی ہی رہی عمرِ رواں کا اِقتباس
تھے کتابِ زندگی پر نام دونوں کے لکھے
بن گیا میں داستاں وہ داستاں کا اقتباس
کر رہا ہے خود کو وہ منسوب میرے نام سے
لکھ رہا ہے عشق کے بارِ گراں کا اقتباس

ممتاز ملک

جو چاہا تھا تو نے تجھے وہ ملا ہے
طلب مال و زر کی نہیں تھی نظر کی
جو قدرت سے لڑ کر جہاں کو بسائے
اسے قدر کیا ہو کسی چشمِ تر کی
ہو ں جن کی تمنا میں افلاک رقصاں
انہیں کیا ضرورت زمینوں پہ گھر کی
میرا ایسا کوئی وسیلہ نہیں ہے
مجھے دے خبر جو تمہارے نگر کی
فقیروں کے دن رات سب سے جدا ہیں
وہ کرتے نہیں ہیں فکر عمر بھر کی
ہمارا توّکل ہماری ہے دولت
کبھی غم نہ کرنا ہماری گزر کی
جو اپنی خودی کو خود ہی دفن کر دے
اسے کیا فکر گمشدہ رہگزر کی

جنہیں کوئی بیچے یا کوئی خریدے
انہیں کیا بتاتے ہو قیمت سفر کی
سنبھالا نہیں جاتا تم سے یہ گھر بھی
چلے بات کرنے کہاں کا شغر کی
جو کانٹوں سے ممتازؔ دھرتی سجا دیں
وہ کیسے کریں گے تمنا شجر کی

ایم زیڈ کنول

ظلمتوں کو سحاب کر ڈالا
ہم نے اپنا حساب کر ڈالا
نغمگی روح میں رچی ایسی
وحشتوں کو رباب کر ڈالا
آگہی کے نقاب میں آکر
جہل نے بے حجاب کر ڈالا
عشق ہی رہ گیا تھا کرنے کو
وہ بھی اب بے حساب کر ڈالا
تلخیاں جامِ جم بنانے کو
زندگی کو شراب کر ڈالا
مذہبِ دوستاں کے دامن میں
ہر عقیدہ حباب کر ڈالا
ولولے کس قدر کنول کے ہیں
آبِ جو کو سراب کر ڈالا

❁

تمہاری یاد کا دفتر کھلا ہے
حریمِ چشم میں گو ہر کھلا ہے
بٹھائے تھے جہاں نفرت نے پہرے
محبت کا وہیں تو در کھلا ہے
درِ عرفان کی اگلی گلی میں
چلے آؤ کہ اک مندر کھلا ہے
کنول کی کہکشاؤں سے نکل کر
وہ جھیلوں میں درِ اختر کھلا ہے

ڈاکٹر رحمان دانش (شہداد پور سندھ)

چھین لی اس نے ہر خوشی سائیں
گھر میں پانی کی ہے کمی سائیں
نوکری کی کرو سفارش تم
چھوڑ دوں گا تری گلی سائیں
عیش رشوت کے مال پر کر لو
چار دن کی ہے زندگی سائیں
پاسباں چور کا ہوا غافل
چار سو ہے ابتری آئیں
پارٹی اپنی جیت جائے تو
پھر تو پکی ہے افسری سائیں
آپ کے پاس یہ جو بیٹھا ہے
اس سے بچیئے ہے مطلبی سائیں
جرم دانشؔ کسی کا کچھ بھی ہو
چند پیسوں میں ہے بری سائیں

ڈاکٹر محمد اشرف کمال

رسمِ دنیا سے رواجوں سے بغاوت کی ہے
ساری دنیا سے جدا تجھ سے محبت کی ہے
جن کے کھلنے سے نئی صبح کے منظر جاگیں
میری آنکھوں نے ان آنکھوں کی تلاوت کی ہے
جس طرح سیپ میں پلتا ہے چمکتا موتی
اس نے یوں میری محبت کی حفاظت کی ہے
جس کی تاثیر سے تقدیر سنور جاتی ہے
آج پھر دل نے ترے نام وہ آیت کی ہے
تو جو آیا ہے تو شبنم سے دُھلا ہے موسم
رنگ وخُشبو نے بھی پھولوں پہ عنایت کی ہے
رنگ و رعنائی کو مفہوم ملے ہیں کتنے
میں نے جس دم بھی ترے چہرے کی قرات کی ہے
دل کی دنیا تہہ بالا ہوئی جاتی ہے
چاند چہرے پہ ستاروں نے قیامت کی ہے

ساحل سلہری

پاس رکھا نہ فاصلہ رکھا
آپ نے کیسا رابطہ رکھا
وہ عجب شخص ہے بچھڑ کر بھی
آنے جانے کا سلسلہ رکھا
مجھ کو تنہائیاں عطا کر کے
اپنے دامن میں قافلہ رکھا
میں تو خوش تھا بہت محبت میں
آپ نے کیوں مغالطہ رکھا
عشق میں اس نے انتہا کر کے
واپسی کا بھی راستہ رکھا
میری بھر پور زندگانی میں
ہجر موسم نے حادثہ رکھا
ایسا پتھر مزاج تھا ساحلؔ
عمر بھر ہم کو پارسا رکھا

❁

تم کو نشاطِ جاں کی فراوانیاں ملیں
ہم کو تو صرف دشت کی ویرانیاں ملیں
رکھتا ہے کب حساب میں جوشِ سفر مرا
ساحل پہ آتے آتے جو طغیانیاں ملیں
اک تیری بے رخی تھی مگر یوں تو نہیں تھا
اب تو ہجومِ شہر میں رُسوائیاں ملیں
مت پوچھ مجھ کو یہ کہ زمانے نے کیا دیا
ورثے میں مجھ کو درد کی پہنائیاں ملیں
غیروں نے بھری بزم میں بیگانہ کہہ دیا
اپنوں سے کی وفا، تو پشیمانیاں ملیں

اَسد رضوی

مست آنکھوں کی حراست میں چلے آئے ہیں
بے اماں لوگ حفاظت میں چلے آئے ہیں
یوں لگا ہم کو تیرے دل میں اُتر کر جیسے
بادشاہ اپنی ریاست میں چلے آئے ہیں
تختۂ دار پہ آئے ہیں تو اب سوچتے ہیں
ہم کہاں آپ کی چاہت میں چلے آئے ہیں
ہم کو اس جنگ کے اسباب نہیں ہیں معلوم
ہم تو بس شوقِ شہادت میں چلے آئے ہیں
میں اَسدؔ کوئی طلبگار نہ تھا فاقوں کا
یہ تو بس میری وراثت میں چلے آئے ہیں

اُلفت بھرا دریا کہیں

منیر باجوہ

بہہ رہا تھا دل میں جو اُلفت بھرا دریا کہیں
نفرتوں کی آندھیوں سے بن گیا صحرا کہیں
لاکھ دنیا میں ہیں چہرے دیکھتے رہتے ہیں روز
کیا کبھی دیکھا ہے اے دل، یار سا چہرہ کہیں
اپنے شعروں کی جولانی پہنچ جائے فلک تک
پر نہیں توفیق لکھے یار کا سہرا کہیں
زندگی کی ہر خواہش بے لگام و بے مہار
کیسے ممکن ہے بٹھائیں اُس پہ ہم پہرہ کہیں
یوں تو دنیا میں سمندر بے شمار و بے کنار
پر نہیں ہے دل سے بڑھ کر کوئی بھی گہرا کہیں
عشق کی دنیا الگ اس کے تقاضے مختلف
آج تک دیکھا نہیں اس کا عَلم لہرا کہیں
دَہر میں راہی وفا کا چلتا جاتا ہے منیرؔ
پا کے منزل سامنے پھر بھی نہیں ٹھہرا کہیں

تِری ضرورت ہے

ایک بس تُو ہی خوبصورت ہے
میری نظروں میں جس کی مُورت ہے
دنیا میں اور بھی ہیں بہت
دل کو ہر دم تِری ضرورت ہے
بِن تِرے نہیں ہے دل میں کوئی
یقین مانو یہ اک حقیقت ہے
ہر جائی بنتے تو ہیں بہت سے لوگ
وفا کی رہ میں یہ بڑی نحوست ہے
انساں کو پرکھنا ہو تو اس کیلئے
فقط آئینہ، اس کی سیرت ہے
انسان اس کو نہ تم سمجھنا کبھی
جس کے دل میں بھری کدورت ہے
عشق آساں نہیں ہے، سمجھو منیرؔ
جگ میں سب سے بڑی مصیبت ہے

جھُکتی وہی ڈالی ہے

اک نظر محبت کی چہرے پہ جو ڈالی ہے
رہی دل کی تڑپ جانم، تا عمر سوالی ہے
پانا بھی اگر چاہوں کیوں پا نہیں سکتا مَیں
کشکول میرا ہمدم، تیری دِید سے خالی ہے
دستور زمانے کے رہتے ہیں سدا غالب
دنیائے محبت تو اس جگ سے نرالی ہے
کم ظرف و بھلے مانس میں فرق ہے بس اتنا
جو پھل سے لدی ہو گی، جُھکتی وہی ڈالی ہے
ہرنی سے ہی سیکھی ہے یہ چال حُسینوں نے
ہرنی سے مشابہ ہے، جو آنکھ غزالی ہے
جس حُسن کی تابانی کرے دل پہ اثر ہمدم
وہ حُسن نرالا ہے، وہ یار جمالی ہے
رکھ دل کو تُو صاف اپنے عزت ہے منیرؔ اس میں
کیا لینا کدورت سے، سینوں میں جو پالی ہے

منور احمد کنڈے

جوش و دیوانگی سلامت ہے
اِس کے اندر سبھی سلامت ہے
پوچھتا ہے یہ صبح دم سورج
چاند کی چاندنی سلامت ہے!
بجھ چکے ہیں چراغ ماضی کے
پر ابھی روشنی سلامت ہے
میں بھی نکلوں گا قافلہ لے کر
گر جنوں کی گلی سلامت ہے
داد ملتی ہے اب تلک ہم کو
اپنی کاریگری سلامت ہے
دل منورؔ بتا رہا ہے مجھے
باغِ دل میں کلی سلامت ہے

معاذ ہاشمی

اندروں درد میں پیوست سماں دیکھتے ہیں
چشمِ آشوب سے ہم رازِ نہاں دیکھتے ہیں
مفلسی ''لوگ اسی واسطے کرتے ہیں قبول''
اپنے اجداد میں غربت کے نشاں دیکھتے ہیں
زنگ آلود نشستوں سے اُنہیں کیا ہوگا
پھوٹی قسمت جو ہتھیلی پہ عیاں دیکھتے ہیں
دولتِ خواب نظر آتی ہے جس چوکھٹ پر
ہم طلب خیز نگاہوں سے وہاں دیکھتے ہیں
تیرگی بند مکانوں کی ہمیں کھا لے گی
چل فلک پر جڑے تاروں کا سماں دیکھتے ہیں
کیا نمو پائیں گے خود کو نظر انداز کرکے
جو اسی ٹوہ میں ہوں لوگ کہاں دیکھتے ہیں
چند سکوں کے عوض بیچ کے وہ اپنے ضمیر
فائدہ سمجھیں مگر ہم تو زیاں دیکھتے ہیں

تبسّم نواز وڑائچ

زندگی پیاس کے ساحل پہ کھڑی ہے اب تک
مشک اُمید کی سوکھی ہی پڑی ہے اب تک
اپنی سی میں نے بھی کر ڈالی ہے کوشش لیکن
مفلسی ہے کہ مرے دوست اَڑی ہے اب تک
جانے کیوں کوئی بھی موسم نہیں آسانی کا
عمر گزری پر وہی سخت گھڑی ہے اب تک
بے حسی نے وہ مرے شہر پہ ڈھایا ہے ستم
بن کے سینے میں انی جیسے گڑھی ہے اب تک
فصلِ باراں ہے کہ بستی پہ مہربان ہوئی
دل کی کھیتی ہے کہ سوکھی ہے سڑی ہے اب تک
کاسہ لیسی میں سدا جبر کی دیکھا ہے اسے
کب ستمگر سے یہ بستی بھی لڑی ہے اب تک؟
تیرے ہی جیسے ہیں پر ظلم سے تیرے جن کی
دیکھ آنکھوں سے لگی خون جھڑی ہے اب تک
سوچئے سمجھئے نکتہ ہے بڑا غور طلب
اپنے لوگوں پہ یہ کیوں زیست کڑی ہے اب تک

عبدالشکور، کلیولینڈ

لمحہ لمحہ زمیں پہ بھاری ہے
ہم نے کیا زندگی گزاری ہے
ظُلم سہتے رہے زمانے کے
ہر نفس ایک زخمِ کاری ہے
سوچتا ہُوں کہاں سے آیا ہُوں
دِل میں کیسی یہ بے قراری ہے
ہم سے پندارِ شرف تھا قائم
اب رہی ہے سو وضع داری ہے
تُم عبث آبرُو کی بات کرو
کس نے دیکھا جو ربّ باری ہے
قافلہِ حسین آتا ہے
کربلا کربلا پہ واری ہے
ہر نفس سانحہ تذبذب ہے
نیزہِ شمر تیری باری ہے
ساعتِ عدل آج آ پہنچی
تُب علینا زباں پہ جاری ہے

اطہر حفیظ فراز

بھلا کیوں نہ محبت کا کریں سامان ہم دونوں
فرشتے ہم نہیں جاناں!! کہ ہیں انسان ہم دونوں
ترے سینے میں بستی ہے، مرے سینے میں بستی ہے
وہ رنگ و نور کی دنیا مگر ویران ہم دونوں
الگ سے دل دھڑکتے ہیں مگر اک سوچ رکھتے ہیں
جدا اپنے یہ قالب ہیں مگر یکجان ہم دونوں
تجھے بھی علم ہے جاناں!! مجھے بھی علم ہے جاناں!!
محبت ایک سی اپنی مگر انجان ہم دونوں
نہ لفظوں کا سہارا ہے نہ گیتوں سے شناسائی
بیاں کیسے محبت ہو بہت نادان ہم دونوں
کبھی شعروں کی صورت میں کبھی غزلوں کے درپن سے
دلوں کی بات کہنے کو کریں سامان ہم دونوں
بہت کافر یہ آنکھیں ہیں حقیقت کو نہ چھپنے دیں
چلو آؤ ان آنکھوں کا کریں چالان ہم دونوں
فراز!! اپنی نگاہوں میں یہ اُلفت کیسی اُلفت ہے
فقط اتنی سی اُلجھن پہ ہوئے حیران ہم دونوں

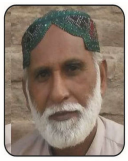

امین اوڈیرائی

تیرے چہرے کو چُھو لیا جب سے
مجھکو ہاتھوں سے پیار ہوگیا ہے
بھیگا بھیگا ہے صبح کا دامن
رات روئی ہے رات بھر شاید
آپ کی یاد جب بھی آتی ہے
آپ کا نام بھول جاتا ہوں
اپنی عریانیت چھپانے کو
روح نکلی بن کے میرا بدن
میں ترے بعد مسکرایا ہوں
ہو سکے تو معاف کر دینا
رنگ پھیکے تھے تیری اُلفت کے
ایک دن میں اُتر گئے سارے
وقت بھی زخم بھر نہیں پایا
تیر نکلا ہوا زباں کا تھا

پروفیسر عبدالکریم خالد

اورہم کو چاہیئے کیا اور کیا درکار ہے
زندگی کرکے اجیرن کہہ رہے ہیں پیار ہے
شعبدہ بازی ہے شیوہ اور اس پر خوش بیاں
ہر سیاستداں یہاں پر اک مرصع کار ہے
جرم ہے میرا کہ میں پیدا ہوا اس ملک میں
جس پہ میری جاں نچھاور اک نہیں سو بار ہے
ہاں یہی اَن مول دھرتی ہی مری پہچان ہے
یہ مری ماں کی طرح ہے تیرا کاروبار ہے
پیرہن اُجلا ترا لیکن دروں تاریک تر
بات حکمت کی مگر تیرے لئے بیکار ہے
کچھ لحاظ و شستگی کا نام تک تم میں نہیں
شرم رتی بھر نہیں چنداں حیا بھی بار ہے
اے مری قسمت کے مالک کون سمجھائے تجھے
مغز سے خالی ذہن اور عقل بھی ہموار ہے
کون ایسا شخص ہے دانا جسے لیڈر کہیں
سب خس و خاشاک ہے آلائش کا انبار ہے

آپ کے ہاتھوں میں ہے تقدیر پاکستان کی
بدنصیبی ہے ہماری آپ کی سرکار ہے

عبدالجلیل عباد

حدِ ادراک سے گزرا ہے خدا خیر کرے
سَرِ بازار وہ چیخا ہے خدا خیر کرے
پیٹتا جاتا ہے قدموں سے زمیں کا سینہ
آسماں اس پہ کوئی ٹوٹا ہے خدا خیر کرے
یہ جنوں خیزی کا موسم جو زمانے بھر میں
ہر گلی کوچے میں برسا ہے خدا خیر کرے
آتشیں لاوا زمینوں سے اُبلنے والا
شعلہ ہر سنگ سے نکلا ہے خدا خیر کرے
ہر نظر اب تو یہ پتھرائی ہوئی لگتی ہے
آنکھ کا دریا بھی سوکھا ہے خدا خیر کرے
آئینے ٹوٹ کے بکھرے ہیں گلی کوچوں میں
سلسلہ دل کا ہی ٹوٹا ہے خدا خیر کرے
اِس زمانے کے جنوں کا یہ جو ابنِ آدم
آگ کے ڈھیر پہ بیٹھا ہے خدا خیر کرے
عدل و انصاف کے سارے ہی شجر سوکھ گئے
مٹی یہ آگ بگولہ ہے خدا خیر کرے

ارشد حمزہ

ہزاروں لوگ گرے پڑے ہیں
اس کے ملنے کی آج باری ہے
تب ہی ہم پہ بھی آس طاری ہے
پوچھنے پر بھی مسکراتے ہو
"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"
رقص میں محو ہیں سبھی کلیاں
اور گلوں پر بھی سحر طاری ہے
زندگی کو بھی میں نے دیکھا ہے
زندگی زندگی سے ہاری ہے
صبر لکھا ہے میری قسمت میں
میرے حصے جو پردہ داری ہے
درد ہلکا تو ہے مگر کیسے
سانس پھولا ہے آہ زاری ہے
شعلہ اٹھنے لگا میرے دل میں
جانے کیسی یہ کار زاری ہے
ظلمتوں کے جہان میں حمزہ
روشنی کی ہی اشک باری ہے

فرخندہ رضوی

عمر بھر کی دوستی کا ہاں بھرم رکھا نہ تھا
بعد مدت کے کھلا مجھ پہ کہ وہ میرا نہ تھا
یوں جلائے زندگی بھر میں نے یادوں کے چراغ
سامنے جن کے چراغ دیگراں جلتا نہ تھا
کل میں اس کی گفتگو سنتی رہی سنتی رہی
اس محبت سے وہ پہلے تو کبھی بولا نہ تھا
کچھ تو اندازہ تھا مجھ کو اس کی آنکھوں کا مگر
دل کی حالت کا یہ اس نے باب یوں کھولا نہ تھا
سوچتی ہوں کیوں میں جیسے گنگ ہو کر رہ گئی
اس طرح سینے میں دل پہلے کبھی دھڑکا نہ تھا
اعتراف عشق نے نمناک کی آنکھیں مری
آنکھ میں کاجل قسم ہے اس طرح پھیلا نہ تھا
اس کی خواہش تھی سو فرخندہؔ میں قائل ہو گئی
وہ پیام عشق بھیجے گا کبھی سوچا نہ تھا

افتخار شاہد ابوسعد

خواب ٹوٹیں تو خیالات میں آ جاتے ہیں
جن کو آنا ہو وہ برسات میں آ جاتے ہیں
آپ کا کارِ تماشا بھی ہے دلکش لیکن
لوگ بھی جلد خرافات میں آ جاتے ہیں
اپنے دکھ درد درختوں کو سنانے کے لئے
ہم اکیلے ہی مضافات میں آ جاتے ہیں
ایک دو خار سے دامن تو الجھتا ہے مگر
ایک دو پھول مرے ہات میں آ جاتے ہیں
تجھ سے ملنے کی خوشی اپنی جگہ ہے لیکن
چند اندیشے ملاقات میں آ جاتے ہیں
اک مسافر کی دعا ایسی لگی ہے مجھ کو
معجزے میرے کمالات میں آ جاتے ہیں
مسئلہ یہ ہے کہ ہم دل کے کھرے ہیں شاہد
بات کرتے ہوئے جزبات میں آ جاتے ہیں

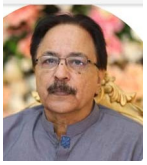

ابرار احمد

راہ دشوار بھی ہے، بے سر و سامانی بھی
اور اس دل کو ہے کچھ اور پریشانی بھی
یہ جو منظر ترے آگے سے سرکتا ہی نہیں
اس میں شامل ہے تری آنکھ کی حیرانی بھی
صرف افسوس کا سایہ ہی نہیں ہے ہم پر
ہم کہ ہیں خواب تب و تاب کے زندانی بھی
اپنے مجبور پہ کچھ اور کرم ہو کہ اسے
کم پڑی جاتی ہے اب غم کی فراوانی بھی
رہ تری چھوڑ کے کیوں جانب دنیا آ
ہم کو جینے نہیں دیتی یہ پشیمانی بھی
بے نیازی کی وہ خو جیسے کبھی تھی ہی نہیں
خواب تھے جیسے وہ ایام تن آسانی بھی

صابر ظفر

ستارے بجھ گئے تو آسماں کیسا لگے گا
جہان تیرگی میں یہ جہاں، کیسا لگے گ
اُچھڑ کر ساحلوں سے موج دل، کیسی لگے گی
بکھر کر آندھیوں میں بادباں، کیسا لگے گا
ٹھہر جائیں گی جب یہ کشتیاں کیسی لگیں گی
گزر جائے گا جب اب رواں، کیسا لگے گ
عمارت ڈھے چکی ہوگی جو سانسیں ٹوٹنے سے
تو پھر یہ سایہ دیوار جاں، کیسا لگے گا
اُتر جائے گا رنگ عاشقی جب اس کے خوں سے
تو دل بیگانہ سود و زیاں، کیسا لگے گا
قفس کیسا لگے گا اڑ گئے جب گا تے پنچھی
نہ ہوگا جب کوئی شور فغاں، کیسا لگے گا
بکھر جائیں گی زنجیریں سبھی زندانیوں کی
زوال نخوت نا مہرباں، کیسا لگے گا
بہت رنگینیاں ہوں گی اگرچہ رہ میں صابر
مسافر کھو گیا تو کارواں، کیسا لگے گا

طاہر مجید

اب تک میری نگاہ میں کوئی بسا نہ تھا
میں جس کو ڈھونڈتا تھا وہ تیرے سوا نہ تھا
کیا ہے وفا نا آشنا یہ طرز گفتگو
جو تو نے کہہ دیا ہے کسی نے کہا نہ تھا
میں اس سے شکوہ سنج تھا وہ مجھ سے بدگماں
اس کشمکش میں پیار کا کوئی مزا نہ تھا
اک میں تجھ کو سمجھا کیا روح زندگی
اک تو کہ اس طرح سے کبھی سوچتا نہ تھا
یوں اجنبی نظر سے مجھے دیکھتے ہو تم
جیسے جہاں میں کوئی کسی کا ہوا نہ تھا
بے تابیوں کی گود میں کتنا اداس ہوں
میں نے بھی دل کسی کو کو یہ اب تک دیا نہ تھا
دل سے مجھے اتار لیکن یہ یاد رکھ
دنیا تجھے کہے گی کہ طاہر برا نہ تھا

ناصر جمیل

ادھورے لمحے کی ایک ادھوری نظم
راتوں میں ایک رات تھی
پورے چاند کی رات تھی
چاندنی نہ تھی کہیں
چاندنی کا احساس تھا
لمحہ لمحہ پگھلتی ہوئی
ہاتھوں سے پھسلتی رات تھی
خشک ہونٹوں پہ جمی ہوئی
جنم جنم کی پیاس تھی
خیالوں میں گم کہیں
وہ دور تھی نہ پاس تھی
دیہان کے آتش دان میں
زرد پتوں کا ڈھیر تھا
جو دل کو چھو کے گزر گئی
وہ گئے دنوں کی بات تھی

مبارک عابد

ڈھلنے لگا سورج تو بڑھے شام کے سائے
تم ایسے گئے ہو کہ نہیں لوٹ کے آئے
یا رب یہ شب ہجر تو کاٹے نہیں کٹتی
بہتا ہے لہو آنکھ سے اشکوں کی بجائے
خاموش نگاہوں میں ہے اظہار تمنا
آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں طوفان چھپائے
کل پرسوں کی امید نے برسوں کو سمیٹا
کب تک کوئی آشنا کے چراغوں کو جلائے
کس طرح کوئی حسن تیرا دل سے اتارے
کس طرح کوئی تیری جوانی کو بھلائے
جو شعر کہے میں نے فقط آپ کی خاطر
میرے ہی زبانی نہ سنے آپ نے ہائے
آنسو سے بڑا کوئی مصور نہیں عابد
جو خون سے جذبات کی تصویر بنائے

نذرانہ۔احمد منیبؔ

صدف کا استعارہ جانتی ہو؟
مطالب کا شمارہ جانتی ہو؟
محبت اک سمندر ہے یقیناً
سمندر کا کنارا جانتی ہو؟
اتر جائے جو اندر تک تمہارے
کچھ ایسا ہے اشارہ جانتی ہو؟
کنارے پر لگائے کشتیوں کو
کوئی ایسا سہارا جانتی ہو؟
قدم اٹھنے لگیں تو سوچ لینا
کوئی رہبر ستارہ جانتی ہو؟

احکم غازی پوری

پرے ہے عقل سے پرواز آرزوئے قلم
حد ِکمال سے آگے ہے جستجوئے قلم
میرے خیال میں مضمون لے کے آتے ہیں
سروشِ علم سے ہوتی ہے گفتگوئے قلم
غذائے ذہن اگر ہے جہاں کی معلومات
دلوں کی پیاس بجھاتا ہے آب جوئے قلم

یہی دعا ہے کہ علم و ادب کے گلشن میں
گلوں کے خامہ سے اُٹھے فضا میں بوئے قلم
ادب کی قدر سے جو نا بلد ہیں کیا جانے
کہ اہلِ علم ہی ہوتے ہیں رو بروئے قلم
یہ علم ایک قلم کار کی عبادت ہے
نماز حرف، سیاہی ہے گر وضوئے قلم
میں آج قوم کی تاریخ لکھنے بیٹھا ہوں
یہ امتحان ہے رہ جا آبروئے قلم
امیرِ شہر ہو احکم ادب کی دنیا کے
اٹھو کہ دستِ سخنور بڑھا سوئے قلم

اختر حسین چیمہ

میری اکھ دا نور نی کڑیئے
کیوں رہنی ایں دور نی کڑیئے
سبز رتاں وچ آجاندا اے
رکھاں تے وی بور نی کڑیئے
جھیڑا تیرے نال ٹرے او
ہو جادے مشہور نی کڑیئے
کی دساں کی بیت رہی اے
زخماں کیتا چور کی کریئے
ساڈا پیار تے پل دو پل اے
عشق دی منزل دور نی کڑیئے
تیرا حسن سدا نئیں رہنا
مندا ایڈا غرور نی کڑیئے
تیرے در تے متھا پیناں
مینوں نہ نامنظور نی کڑیئے
مندی کرنی نہ ایں سہنی
اپنا اے منشور کی کڑیئے
تینوں اپنا بنا لیندا پر
اختؔر سی مجبور نی کڑیئے

مسعود چوہدری

زمانے میں سر کو اُٹھا کر چلے ہیں
دیئے سے دیئے جلا کر چلے ہیں
یہ جو ہم پر حق تھا ادا کر چلے ہیں
جہاں تک ہوا ہے وفا کر چلے ہیں
نکل آئے گا ساتھ اپنے زمانہ
ہتھیلی پہ سورج سجا کر چلے ہیں
تجھے اتنا پوجا ہے جانِ تمنا
صنم سے تجھے ہم خدا کر چلے ہیں
کتاب محبت کے ہر شعر میں ہم
رقم دل کا ہر ماجرا کر چلے ہیں
نہیں کوئی دامن پہ دھبہ ہمارے
من و تو کا جھگڑا مٹا کر چلے ہیں
وہی جیتتے ہم نے دیکھی ہے بازی
جو مہرے کو اپنے بچا کر چلے ہیں
زمانہ ہمیں بھول پائے گا کیسے
زمانے کو اپنا بنا کر چلے ہیں
شب تار کے لمبے رستے میں مسعودؔ
لہو کو جلا کر ضیاء کر چلے ہیں

احمد مبارک

بیٹھے بیٹھے ہی بہت نام مجھے چاہیے ہے
اپنی توصیف تو ہر کام مجھے چاہیے ہے
اپنا کردار بھی میں اس میں چھپا سکتا ہوں
بس یہ اک جامۂ احرام مجھے چاہیے ہے
جس کو چاہوں میں جہاں چاہوں بنا دوں کافر
ان دنوں ایسا ہی اسلام مجھے چاہیے ہے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں شام تلک
اور اسی بات کا انعام مجھے چاہیے ہے
جا بھی سکتا ہوں پلٹ کر ترے در کی جانب
لیکن اس وقت تو آرام مجھے چاہیے ہے
جا نکلنا تھا کسی جھونک میں افلاک کے پار
ہے کہاں؟ جو تہہ اجرام، مجھے چاہیے ہے
قصہ گو وقت کہاں ساری کہانی کے لئے
دیر مت کر فقط انجام مجھے چاہیے ہے
اک کتابوں سے بھری صبح ہے درکار مجھے
اور اک مے سے بھری شام مجھے چاہیے ہے
اپنی بے کاری سے کچھ تنگ بھی آیا ہوا ہوں
اب تو کرنے کو کوئی کام مجھے چاہیے ہے

جمیل الرحمان

موسم اور مسافر خواب دکھاتے ہیں
زرد شجر کے پتے شور مچاتے ہیں
زندہ ہیں اور وقت نہیں ہے جینے کا
ہم تو بس جینے کی رسم نبھاتے ہیں
یاد علی بابا کو کوئی اسم نہیں
چور عبث کیوں اپنی رات گنواتے ہیں
کیسے دن کی راکھ ہے جس کو چٹکی بھر
دریا دریا پاگل روز بہاتے ہیں
قید ہے کوئی آندھی گھر کے آنگن میں
ہم دیواریں اونچی کرتے جاتے ہیں
سو جاتی ہے جب آواز پرندوں کی
اک دہشت کے سائے پر پھیلاتے ہیں
دل پر حد جاری ہونے کی خبر جمیل ج
نہیں سنائی کیا کیا مجھے سناتے ہیں

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن برطانیہ کی ادبی نشست

مورخہ ۱۹ جولائی ۲۰۲۲ بروز منگل عرفان شہزاد صاحب کے گھر پر ایک ادبی نشست کا انعقاد ہوا۔جس کی صدارت محترم صدر صاحب تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن برطانیہ نے کی۔عرفان شہزاد صاحب نے خوب خوردونوش کا انتظام کیا ہوا تھا۔گرمی کی وجہ سے ستو،ملک شیک،روح افزا شربت کا خاطر خواہ انتظام تھا۔

مظفر احمد صاحب،نعیم رضا صاحب،ڈاکٹر نصیر احمد صاحب،طارق صفدر،عبدالمنان اظہر صاحب، عبدالقدیر کوکب، وسیم باری صاحب، ظفر ساہی صاحب،شائق نصیر پوری،ڈاکٹر طارق انور باجوہ صاحب،طفیل عامر صاحب سب شامل تھے۔شعری نشست کے بعد کھانا کھایا اور رات گئے یہ ادبی نشست اختتام کو پہنچی۔عرفان شہزاد نے میزبانی کا حق نبھایا۔

منقول کتب خانہ شہر غزالہ کے وال سے

....مشہور مغنیہ گوہر جان ایک مرتبہ الہ آباد گئیں جہاں وہ جانکی بائی کی مہمان بنیں۔انہوں نے اپنی میزبان سے کہا کہ وہ خان بہادر سید اکبر حسین (اکبر الہ آبادی) سے ملنا چاہتی ہیں۔ میزبان انہیں لے کر دوسرے ہی دن اکبر کے ہاں پہنچ گئیں،تعارف کرواتے ہوئے جانکی بائی نے کہا کہ یہ کلکتہ کی مشہور مغنیہ گوہر جان ہیں،آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔اکبر نے کہا،''زہے نصیب، ورنہ نہ میں امام،نہ غوث،نہ قطب اور نہ کوئی ولی جو قابلِ زیارت خیال کیا جاؤں، پہلے جج تھا،اب ریٹائر ہو کر صرف اکبر رہ گیا ہوں،حیراں ہوں کہ آپ کی خدمت میں کیا تحفہ پیش کروں۔''

گوہر نے کہا،''کوئی شعر لکھ دیجیے کہ یادگار رہے۔''اکبر نے ایک کاغذ لیا اور شعر لکھ کر گوہر جان کی طرف بڑھا دیا۔شعر یہ تھا ۔

خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

گوہر بڑے ادب سے اسٹیج پر آئیں اور جہاں سے آغاز کیا تو اکبر دم بخود رہ گئے۔ گوہر نے برجستہ کہا کہ:

یوں تو گوہر کو میسر ہیں ہزاروں شوہر
ہاں پسند اس کو نہیں ایک بھی اکبر کے سوا

گوہر جان کی تصویر:120 سال پہلے متحدہ ہندوستان کی مشہور مغنّیہ اور رقاصہ گوہر جان کی تصویر جن کو بھارت میں پہلی گراما فون ریکارڈنگ کرانے کا اعزاز حاصل ہے۔ان ہی کے لئے اکبر الہ آبادی نے شعر کہا تھا۔

خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

(منقول)

سلطان صابری کی کتاب ''روح کی زندگی'' کی رَسمِ اَجراء اور مشاعرہ

25 جون 1922 کو سلطان صابری صاحب کی کتاب ''روح کی زندگی'' کی رسم اجراء اور مشاعرے کا انعقاد نار بری (norbury) لندن کے چرچ سینٹ اوسوالڈ (st.oswald) میں دوپہر کے دو اور پانچ بجے کے درمیان ہوا۔ رَسمِ اَجراء کا افتتاح مشہور ادیب شاعر اور صحافی جناب رانا عبدالرزاق خاں صاحب کے ہاتھوں ہوا جو کہ ماہنامہ قندیل ادب کے چیف ایڈیٹر بھی ہیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر احتشام صابری نے انجام دیئے جو کہ ایک جی۔ پی ہونے کے علاوہ ایک یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر۔ رائل کالج آف جی پیز کے سابق صدر اور MNCGP کے متحمن (Examiner) اور سلطان صابری صاحب کے چھوٹے بیٹے بھی ہیں۔ رانا عبدالرزاق خاں صاحب کے علاوہ مشہور سیاسی تجزیہ نگار صحافی اور براڈ کاسٹر جناب شبیر رضوی صاحب بھی مہمان خصوصی تھے۔ پروگرام کی ابتداء مولوی عبدالطیف صاحب نے تلاوت قرآن پاک سے کی۔ انکا تعلق لیبیا (libiya) سے ہے اور سٹن (Sutton) کے اسلامک سنٹر میں تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ تلاوت کلام پاک کے بعد ڈاکٹر احتشام صابری صاحب نے اپنے والد صاحب کی زندگی اور نسلی تعصب کے خلاف انکی جدوجہد پر ایک مضمون پڑھا۔ اسکے بعد رانا صاحب نے کتاب پر سیر حاصل تبصرہ ایک پر مغز مقالے کے ذریعے کیا۔ پھر جناب رَضوی صاحب نے کتاب کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ سلطان صابری صاحب نے ایک غیر معمولی اور مشکل موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ جو کہ انتہائی دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ چونکا دینے والا بھی ہے۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ ہماری نئی نسل کو بھی انکے خیالات اور تحقیق سے آگاہی ہو سکے۔ یہ بات نہایت خوش آئیند تھی کہ ٹرینوں کی ہڑتال کے باوجود اس محفل میں سامعین کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ جن میں ڈاکٹرز وکلاء، اور دیگر پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی شامل تھے۔ کھانے پینے کا انتہائی معقول انتظام تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ایک انتہائی چمکیلا روشن اور گرم دن تھا۔ چرچ کے جس ہال میں یہ تقریب منعقد ہوئی وہ انتہائی خوبصورت اور ہوادار تھا۔ سامنے سرسبز وشاداب اور کھلا لان تھا۔ پیچھے کیطرف ایک بڑا کار پارک تھا جسکی وجہ سے بذریعہ کار آنے والوں کے لیے کسی دُشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جناب رانا صاحب اور رضوی صاحب کے بعد صاحبِ کتاب کی باری آئی۔ سلطان صابری صاحب انگریزی اور اردو کے کہنہ مشق مقرر ہونے کے علاوہ ایک سالیسٹر، ادیبِ وشاعر اور صحافی بھی ہیں۔ 1980 کی دہائی میں لندن کے روزنامہ جنگ میں انکے مضامین۔ وکیل کے بغیر جائیداد کی خرید فروخت اور برطانیہ میں کسٹمز کے قواعد۔ باقاعدگی سے چھپا کرتے تھے۔ جناب صابری صاحب نے اپنی 25 منٹ کی تقریر میں اپنی کتاب کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے روح اور زندگی کے موضوع پر فکر ونظر کے ایسے ایسے زاویئے کھولے کہ لوگ دم بخود ہو کر انہیں سنتے رہے اور وقت کے گزرنے کا کچھ پتہ

نہیں چلا۔ پروگرام کے پہلے حصہ کے بعد چائے کا وقفہ ہوا اور تقریباً 20 منٹ کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا جسکی صدارت رانا عبدالرزاق خاں صاحب نے کی اور نظامت کے فرائض سلطان صابری صاحب نے انجام دیئے۔ چونکہ تقریباً کئی سال بعد کرائیڈن میں یہ پہلا بڑا مشاعرہ تھا اسلئے سامعین کی خوشی قابلِ دید تھی۔ حسب روایت مشاعرے کا آغاز سلطان صابری صاحب نے بطور ناظم اپنے کلام سے کیا اور سامعین سے داد پائی۔ اُنکے بعد کہنہ مشق اور بزرگ شاعر جناب محمود علی محمود نے اپنے نعتیہ کلام سے لوگوں کے دلوں کو گرمایا پھر ایک ایسے شاعر کی باری آئی جن کے بغیر لندن کا ہر مشاعرہ نامکمل رہتا ہے وہ تھے شائق نصیر پوری صاحب۔ انہوں نے پہلے تو ایک نعت سنائی پھر گل و بلبل کا ایک ایسا افسانہ چھیڑا جسکو لوگ تو دلچسپی سے سن ہی رہے تھے لیکن خود شائق صاحب بھی بے خود ہو کر سنائے جا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد جناب شبیر رضوی صاحب کا نام پکارا گیا انہوں نے اپنی انتہائی خوبصورت اور فکر انگیز انگریزی کی ایک نظم سنائی جسکو سامعین نے بے حد پسند کیا ابھی انکے کلام کا سرٹوٹا بھی نہیں تھا کہ ناظم نے ایک اور مشہور شاعر اور ادیب جناب فہیم اختر صاحب کو دعوت کلام دی۔ انہوں نے اپنے خوبصورت اشعار اپنے مخصوص انداز میں کچھ اس طرح سے سنائے کہ حاضرین جھوم اُٹھے۔ سب سے آخر میں صدر محفل جناب عبدالرزاق خاں صاحب کی باری آئی جو کہ اب تک کرسئ صدارت سے تمام شعراء پر نہائت فرخدلی دلی سے داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے تھے انکی باری آتے ہی ہال میں ایک سناٹا چھا گیا اور سب لوگ انکا کلام سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ رانا صاحب جو کہ نہ صرف ایک کہنہ مشق شاعر ہیں جبکہ ایک ادیب صحافی ہونے کے باعث دلوں کو جیتنے کا فن بھی جانتے ہیں انہوں نے اپنے خوبصورت الفاظ کے موتیوں میں پروئے ہوئے اور بامعنی کلام سے ایک سماں باندھ دیا۔ تالیوں کی گونج میں جب انہوں نے اپنا مقطع پڑھا تو جی چاہتا تھا انکو سنتے ہی رہیں لیکن افسوس کہ وقت نے وفا نہ کی اسلئے مجبوراً اس رنگا رنگ محفل کو ایک خوبصورت موڑ دیکر چھوڑنا پڑا۔ یوں تقریباً پانچ بجے شام یہ یادگار محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔ ناظم مشاعرہ سلطان صابری صاحب نے اپنا یہ شعر پڑھ کر سب سامعین کو الوداع کہا۔

شیشہ دل میں جو آیا کسی اور کا عکس
آئینہ ٹوٹ گیا اتنی سی تقصیر کے بعد

(سلطان صابری)

کتاب روح کی زندگی

تبصرہ : رانا عبدالرزاق عاصی صحرائی

سلطان صابری صاحب نے ایک انوکھے موضوع پر قلم اُٹھایا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بعض حالات و واقعات نے ان کے اندر یہ تحریک پیدا کی کہ ایسے موضوع کہ زیر بحث لائیں جس پر صاحبِ تجربہ ہی کچھ بیان کر سکتے ہیں۔ خوابوں اور روحانی دنیا کے معاملات بہت اُلجھے ہوے ہیں۔ دنیا کے سارے مذاہب میں حیات بعد الموت کا تصور موجود ہے۔ اسی وجہ سے ہر مذہب میں بیشمار ایسی روایات ہیں۔ گویا کہ روحوں سے تعلق قائم کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے قدرت اللہ شہاب کی کتاب سے بہت سے حوالہ جات کو نقل کیا ہے۔ ان میں قدرت اللہ شہاب صاحب کے ساتھ پیش آنے والے مبینہ طور پر مافوق الفطرت واقعات شامل ہیں۔ جبکہ انہیں روحوں یا بد روحوں سے واسطہ پڑا۔ پھر انہوں نے قرانِ کریم کے حوالے بھی دیئے، جہاں پر دنیا کی زندگی کے خاتمے پر، مرنے کے بعد کی زندگی کا زکر ہے پھر شعور اور لاشعور کی بحث چھیڑی ہے۔ اس کے بعد سے ہی تذکرہ کیا کہ یہودیت، عیسایت اور دوسرے مذاہب میں مرنے کے بعد کے وقت سے لے کر حقیقی نجات تک کا سفر کیسے طے ہوگا۔ ہندومت، جین مت اور سکھ مذہب میں موت بعد کا تصور کیا ہے۔ اور روحانی سفر کے مراحل کون کون سے ہیں۔ بدھ مت کے خیالات اور تعلیم کیا ہے۔ بدھ کے مطابق زندگی اور موت کا دارومدار کن چیزوں پر ہے۔ ہوا۔ مٹی۔ آگ۔ پانی۔ رنگ۔ آواز۔ حواس، جزبات، احساسات، شعور، جہالت، نیند، بڑھاپا، خوشحالی، موت وغیرہ کی مثالیں دی ہیں۔ اعمال کے اثرات کیا ہیں۔ زرتشتی اور پارسی مذہب میں اچھائی اور برائی کے راستوں پر چلنے کے بعد پھر زندگی کے انجام اور اس کے بعد کی زندگی کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ اواگون کا نظریہ اور پھر ایسے واقعات درج کیے ہیں گویا حقیقی طور پر مرنے والے پھر سے دنیا میں آئے، کسی اور شخصیت کے روپ میں ان ان کی بعض نشانیوں سے ان کو پہچانا گیا۔ روحوں سے رابطہ کے عنوان سے جو چیپٹر ہے۔ اس میں بھی نہایت دلچسپ باتیں بیان کی گئی ہیں۔ روحوں کو بلانے کے عمل و حاضرات وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس مضمون میں دوسرے مذاہب کی روایات کا تذکرہ ہے۔

بھوتوں۔ آسیب کے وجود پر بحث کی گئی ہے۔ کیا واقعی ان کا وجود ہے یا ذہنی انتشار۔ دماغی خلل اس کی وجہ ہے دماغ میں آکسیجن کی کمی یا زہنی

جمود اس کا باعث ہے۔خوابوں کی حقیقت، سچی خوابیں، قریب المرگ لوگوں کو موت سے پہلے ایسی خوابیں نظر آنا جس میں ان کو انکی موت کی خبر دی گئی، خواب میں وفات شدہ لوگوں سے ملاقات ہونا۔اسلام میں کثرت سے ایسے واقعات ثابت ہیں۔جس میں لوگوں کو ان کی موت کا وقت بتا دیا جاتا ہے۔ بعض واقعات بہت عجیب وغریب ہیں گویا کہ بے ہوشی کی حالت میں، اپنے مرنے کا منظر دیکھا اور پھر موت کی وادی سے واپس زندگی کی طرف لوٹ آئے۔عمومی طور پر دلچسپ کتاب ہے۔اس کتاب کی اچھی بات یہ ہے کہ پڑھنے والے کو جوڑ کے رکھتی ہے وہ واقعات کا تسلسل جس سے دلچسپی قائم رہتی ہے۔خاکسار اس کتاب کی رونمائی کے موقع پر محترم سلطان صابری صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں۔اس دعا کے ساتھ اپنے تبصرے کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

نواب آف کالا باغ

نواب آف کالا باغ بیمار پڑ گئے اُن کے ذاتی معالج نے پراسٹیٹ کینسر کا خدشہ ظاہر کیا اور کہا اُن کا علاج صرف لندن میں ہی ممکن ہے۔نواب صاحب لندن جانے پر راضی ہو گئے تو اُن کے معالج نے لندن کے ایک مشہور ماہر سرطان (ڈاکٹر) جو اُن کے استاد بھی تھے سے اپوائنٹمینٹ لی اور نواب صاحب کو لے کر لندن چلے گئے۔مقررہ دن اور وقت پر گورا ڈاکٹر نواب صاحب کو چیکنگ رُوم میں لے گیا آدھے گھنٹے کی چیکنگ کے بعد باہر نکلا تو کافی پُرسکون اور مطمئن تھا۔اُس نے بتایا کہ پراسٹیٹ کینسر نہیں ہے میں نے دوا تجویز کر دی ہے۔ ہدایت کے مطابق ایک ماہ تک استعمال کرتے رہیں آرام آجائے گا اور مزید مشورے کی ضرورت پڑے تو فون پہ بات کر لینا۔رخصتی سے پہلے گورے ڈاکٹر نے نواب صاحب کے ذاتی معالج یعنی اپنے شاگرد کو بازُو سے پکڑا اور ایک طرف لے جا کر اُس سے شکوہ کیا'' مجھے تو تم پر فخر تھا تم میرے بہت قابل شاگرد ہو مگر تم نے تو آج مجھے بہت مایوس کیا جب صرف ایک اُنگلی مریض کی Rectum میں ڈال کر پتہ چل سکتا تھا اُسے پراسٹیٹ کینسر ہے یا نہیں تو تم اُسے اتنے پیسے خرچ کر کے اتنی دُور میرے پاس لندن کیوں لے کر آئے؟ نواب صاحب کے معالج نے جواب دیا سر جس جگہ آپ نیا اُنگلی دی میں اگر پاکستان میں نواب صاحب کو اُس جگہ اُنگلی دیتا اُنہوں نے میرا پورا خاندان مروا دینا تھا سو مجھے مجبوراً اُنہیں اُنگلی دلوانے آپ کے پاس لانا پڑا نتیجہ کچھ بیماریوں کی تشخیص اور علاج پاکستان میں بھی میسر ہیں پر جو سکون اطمینان اور شفا گورے ڈاکٹر کی اُنگلی میں ہے وہ پاکستانی ڈاکٹر کی اُنگلی میں کہاں؟؟؟

جبیں ناز اں کا مضمون

مصنفہ گیتا نجلی شری کو مشترکہ بکر: انعام ملنا خوش آئیند قدم ہے۔

مصنفہ گیتا نجلی شری کو بُکر انعام ملنا ہندستان کی قومی زبان کی ایک اہم کامیابی ہے تو وہیں اس کے لیے ایک تاریخی لمحہ بھی ہے کیوں کہ پہلی بار ہندستان کی سب سے بڑی قومی ہندی زباں کو عالمی سطح کے انعام سے نوازا گیا ہے، لیکن یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ پچاس ہزار پونڈ کا بُکر انعام ریت سمادھی کے انگریزی ترجمے tomb of sand کو مشترکہ طور پہ ملا ہے۔کیونکہ بُکر انعام کی اولین شرائط میں شامل ہے کہ ناول انگریزی زباں میں ہو اور اس کی اشاعت بھی برطانیہ میں ہوئی ہو...ظاہر سی بات ہے خواہ کسی بھی زباں میں تحریر کوئی ناول زبان و بیان موضوعات و اسلوب کے لحاظ سے جتنا بھی اعلیٰ پایہ کا ہو وہ بُکر انعام کا مستحق قرار نہیں پا سکتا، جب تک کہ انگریزی زباں میں نہ لکھا گیا ہو اور اس کی اشاعت برطانیہ کے پبلشرز نے نہ کی ہو...آپ کو بتاتی چلوں کہ ریت سمادھی ناول 2018ء راج کمل ناشر نے شائع کیا تھا۔چند لوگوں نے پڑھا (عام قاری نہیں، ادب جگت سے منسلک لوگوں نے پڑھا) اس وقت ان لوگوں نے اسے منفرد ناول قرار دیا۔اور اسے ہندی ادب کا عظیم اور سنگ میل ٹھہرایا۔بات آئی گئی ہو گئی یعنی کہ لوگ اس ناول کو بھول گئے۔لیکن گیتا نجلی شری مطمئن نہیں بیٹھیں، انہوں نے اس ناول کا انگریزی ترجمہ کروانے کی ٹھان لی، تاکہ اپنی آواز بیرون ممالک تک پہنچا سکیں۔ان کی باریک نظر نے مترجمہ ڈیزی راک ویلی کو ڈھونڈ نکالا۔

یہاں بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی کوئی بھی زباں انگریزی زباں کے بغیر ادھوری ہے۔اگر اس ناول کا انگریزی ترجمہ نہیں ہوا ہوتا تو یہ ناول بھی بشمول اردو اور دیگر زبانوں کے درجنوں اعلیٰ پائے کے ناولوں کی مانند محدود طبقے تک مقبول ہو کر اپنی بدقسمتی پہ ماتم کناں رہتا۔ہندی ادب میں ازیں قبل بھی متعدد ناول لکھے گئے اور خود گیتا نجلی شری نے کئی ناول لکھے پہلا ناول 2004ء میں شائع ہوا اس کے بعد تروہت، ہم جنس پرستی کے موضوع پہ مبنی تھا، ہندی ادب میں پہلی بار ہم جنس پرستی جیسے حساس مسئلے کو ناول کا موضوع بنایا گیا تھا۔اتین عورت کے کردار کے توسط سے ہم جنس پرستی کے

متعلق مختلف آرااور زوایہ نظر پیش کیے گئے۔مذکورہ ناول ادبی حلقوں میں موضوع بحث بنا۔اس بعد خالی مکان اس طرح پانچ ناول متواتر شائع ہوئے ہمارا شہر کے نام سے ایک ناول 1990ء میں آیا۔اپنی نوعیت کا یہ پہلا ناول تھا اس ناول میں ہندوستان کی سیاست کے بدلے ہوئے روپ کو موضوع بنایا گیا تھا، کہ کس طرح سیدھے سادے عوام کی رگوں میں نفرت کا لہوا تار دیا گیا ہے، جس کا احساس عوام کو نہ ہوسکا۔اور وہ اسے اپنا دھرم سمجھنے لگا۔

ہندی ادب کے ادیب اور نامور مبصر آلوک واجپائی ریت سمادھی کو ہمارا شہر کی توسیع قرار دیتے ہیں...وہ کہتے ہیں اس ناول کی بنیاد ہمارا شہر ہے ریت سمادھی کو عورت یعنی کہ سن رسیدہ ماں اور بیٹی کے رشتے کے توسط سے ہندستان یا برصغیر (کہہ لیں) کے سماجی وسیاسی منظر نامے کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ جسے ہمارے معاشرے کا آئینہ کہنا چاہئے...جس کا پس منظر تقسیم ہند ہے۔ہندستان کی تقسیم عالمی سیاست کا بڑا المیہ رہا ہے، تقسیم ہند کے اثرات 75 سال گزرنے کے بعد بھی محسوس کئے جارہے ہیں۔چوتھی پانچویں نسل متاثر اور نبرد آزما نظر آتی ہے۔اس ناول کو تین حصوں میں بیان کیا گیا ہے۔ آخری حصہ ہی اس ناول کا ماخذ ہے۔جس کے اظہار کے لیے انہوں نے پہلے اور دوسرے پارٹ کو اہم جز بنانا لازم جانا۔بات یہ نہیں کہ انہوں نے کیا کہا؟ اہم یہ ہے کہ اسے انہوں نے کس طرح پیش کیا۔موضوع کے ساتھ طرز تحریر انداز اسلوب زباں و بیان کا استعمال زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔جو قلم کار اپنی بات قاری کے دل میں اتارنے میں کامیاب ہوتا ہے۔وہی قلم کا دھنی کہلاتا ہے۔اور گیتا نجلی شری قلم کی دھنی مانی جاتی ہیں۔وہیں پر عزم بھی یہ اپنے فن کے لیے مسلسل کوشاں رہتی ہیں انہوں نے یہ ناول نہایت مستقل مزاجی اور نہایت جانفشانی سے آٹھ سال کے طویل عرصے میں مکمل کیا۔آج کے الیکٹرونک تیز رفتار عہد اور عجلت پسند مزاج کے ماحول میں آٹھ سال کافی عرصہ ہوتا ہے۔

ہندی ادب کے اہم ادیب وقلم کار گیتا نجلی شری کے لکھنے کے عوامل اور طریقہ کار کو سراہتے ہوئے نہیں تھکتے۔گیتا نجلی شری کی استاد کرشنا سوبتی جو خود ہندی ادب کی مقبول خاص وعام رہی ہیں۔گیتا نجلی شری کو ہندی ادب کا درخشاں باب کہا تھا، ان کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوچکی ہے۔مزے کی بات یہ کہ گیتا نجلی بُکر انعام لیتی ہوئی جہاں مترجم ڈیزی راک سے گلے ملیں۔وہیں کرشنا سوبتی کو بھی یاد کیے بنا نہیں رہیں۔80 کی دہائی میں ہندی زباں کا سب سے معیاری رسالہ ہنس میں اپنی پہلی کہانی بیل پتر ارسال کی ان دنوں ہنس کے مدیر راجندر یادو ہوا کرتے تھے وہ یہ کہانی دیکھ کر کافی خوش ہوئے اور متاثر بھی، اس کے بعد متواتر یکے بعد دیگرے قواعد کی روگردانی کرتے ہوئے ان کی تین کہانیاں شائع کیں۔ایک تعجب خیز بات بتاتی چلوں کہ بھارت میں ادب کی دنیا کی اہم تنظیم ساہتیہ اکادمی کی نظر کیوں چوک گئی؟ اس نے اس ناول کو اب تک ساہتیہ ایوارڈ سے محروم کیوں رکھا؟۔خود بخود کئی سوالات کھڑے ہوجاتے ہیں۔اسے اکادمی کی غفلت، لاپروائی مانا جائے یا کچھ اور...؟ ہمارے یہاں انعام کی تقسیم کو لے کر جو سیاست اور بازی گری ہوا کرتی ہے اس سے ہم سب واقف ہیں۔تعجب اور افسوس اس امر کا ہم سب مہر بہ بلب رہتے ہیں۔اب تو خیر ساہتیہ انعام ملنا طے ہے، جو اس ادارہ کا ایک مضحکہ خیز اقدام ہوگا۔اور پھر ساہتیہ اکادمی ہی کیوں۔جب بُکر انعام کی خبر سوشل سائیٹ وغیرہ پر وائرل ہونے لگی تب بہت سے لوگوں نے پوچھا یہ گیتا نجلی شری کون ہے؟ یہ حال ہے ہماری قوم کا جو اپنی زباں وادب اور قلم کاروں سے بالکل ناواقف رہتی ہے۔اس سے بڑا قومی المیہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ مادری اور قومی زباں وادب کے حوالے سے۔؟ بُکر انعام کے حوالے سے اردو ادب کے متعلق چند اہم نکات پہ اپنے خیالات رقم کرنا چاہتی ہوں۔

اب ایسا نہیں کہ آگ کا دریا چاندنی بیگم، انقلاب اداس نسلیں، علی پور کا ایلی، بستی راجہ گدھ، اور انسان مرگیا، خدا کی بستی، کئی چاند تھے سر آسماں، یا پھر مرگ انبوہ، وغیرہ کا انگریزی ترجمہ کسی نے نہیں کیا؟ ان ناولز میں کئی ناولز کے انگریزی زباں کے سوا دیگر زباں مثلاً روسی، فرانسیسی، جاپانی زبان میں بھی تراجم ہوئے لیکن ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ جس طرح افسانہ نویسی، ناول نگاری ایک فن ہے، ویسے ہی ترجمہ نگاری بھی فن کی حیثیت رکھتی ہے، اس کی مثال یہ کہ جس طرح رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتا نجلی کو مترجم نصیب ہوا، ویسا مترجم اقبال کو مل گیا ہوتا تو نوبل انعام اقبال اور ٹیگور کو مشترکہ طور پہ ملا ہوتا... عمر خیام کی رباعی کی عالمی شہرت کی وجہ انگریزی ترجمہ مانا جاتا ہے۔تو اس کا یہ مطلب یہ نکلتا ہے کہ مترجم ظہیر الدنے رباعی کے مفہوم کو جس خوبصورتی سے ترجمے کے قالب میں ڈھالا یہ ان ہی کا ہنر تھا۔اس سے قبل روسی زبان میں پروفیسر ولنتین زوکوفسکی ترجمہ کر چکے تھے، اردو میں

رباعی کا ترجمہ مَیں راجی نے کیا۔ آگ کا دریا اور انقلاب جیسے معرکتہ الآرا ناولز کے تراجم مصنف کے سوا (ادبی دنیا جانتی ہے کہ قرۃ العین حیدر اور خواجہ احمد عباس ذولسان مصنف تھے، اپنی تخلیق کا انگریزی ترجمہ خود کیا کرتے تھے) ڈیزی راک ویلی، جیرالڈ جیسے مترجم تراجم کرتے تو تعجب نہیں کہ بُکر تو کیا سویڈش اکیڈمی نوبل کے لیے منتخب کر ڈالتی۔ اب یہ بات ہم سب پر عیاں ہو جاتی ہے کہ کسی بھی زبان کے ادب کو عالمی اعزاز و انعامات یا عالمی شہرت حاصل کرنے کے لیے انگریزی زبان کی بیساکھی کا سہارا لیے بغیر چارہ نہیں۔ ان مقامات پہ ہمیں اپنی زبان کے متعین حدود کا احساس شدت سے ستاتا ہے اور انگریزی زبان کے عالمی درجہ کا اعتراف کشادہ قلبی سے کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اب ہم اپنے ادبی سرمائے کو تراجم کے توسط سے عالمی ادب میں متعارف کروانے کا رواج قائم کریں نیک نیتی، منظم اور مبسوط طریقے سے۔ تبھی ہماری زبان کو عالمی سطح پہ فروغ حاصل ہوگا اور ہمارا ادب عالمی انعامات کا مستحق ہوکر عالمی خراج حاصل کر سکے گا۔۔

آخر میں گیتا نجلی شری کے متعلق بتادوں کہ یہ اتر پردیش کہ مین پوری میں پیدا ہوئیں۔ لیڈی شری رام کالج سے گریجویٹ کیا جے این یو (دہلی) یونورسیٹی سے تاریخ میں تعلیم حاصل کی، فی الوقت دہلی میں مقیم ہیں۔ گیتا نجلی شری جہاں اپنی مادری زبان ہندی کے نامور ادیب/ ادیبہ کرشنا سوبتی جنھیں اپنی محسنہ اور استاد مانتی ہیں، پریم چند، نرمل ورما، کرشن بلدیو، سے لیکر ونود کمار کی قدرداں ہیں اردو ادب سے کافی حدتک متاثر نظر آتی ہیں۔ منٹو کا تذکرہ 'ریت سمادھی' میں کرتی ہیں تو انتظار حسین کی دیو مالائی کہانی، داستان، قصہ گوئی کو کافی پسند کیا کرتی ہیں۔

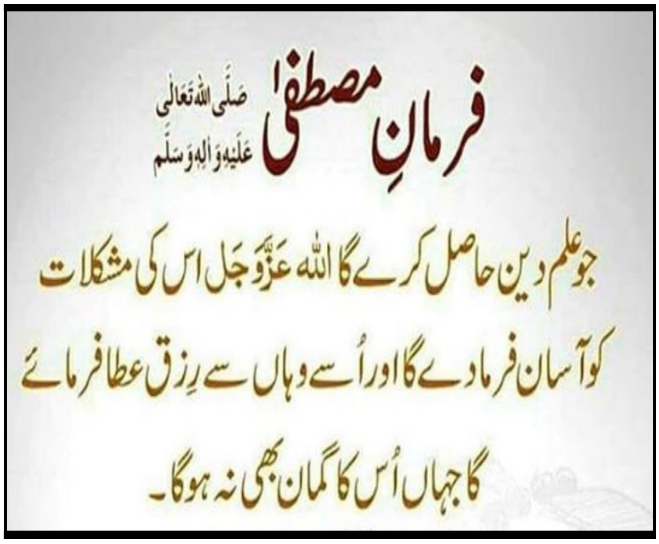

نثر اور نظم میں فرق اور نظم کی اقسام

شمسہ نجم

جب کوئی ادیب اپنے تخلیقی ذہن میں موجزن خیالات کے ذخیرے کو قلم بردکر کے صفحہ قرطاس پر بکھیرتا ہے تو اسے نثر کہتے ہیں۔ لیکن جب ایک شاعر اپنے تخیل کے خوبصورت تنے بانے ایک لے میں سلجھے ہوئے تاروں کی صورت میں کہتا ہے تو ایک خوبصورت نظم تخلیق ہوتی ہے نثر کے لیے کسی بحر کی ضرورت ہے نہ قافیہ اور ردیف کی لیکن قلم کی روانی محاورات و استعارات کا چابکدستی سے استعمال اور اعلیٰ تخیل تحریر کا حسن دوبالا کرتے ہیں تحریر میں جتنی روانی اور زبان پر جتنا عبور ہوگا اس کے مطابق اسی قدر اعلیٰ اور معیاری نثری تحریر سامنے آئے گی لیکن نثری ادب کی مختلف اصناف ہیں ناول افسانہ، مختصر افسانہ کہانی داستان آپ بیتی اور مائیکروفکشن وغیرہ۔ اوران اصناف میں نثر کا معیار ادیب کی قابلیت اور مزاج پر ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ تر موضوع اور کرداروں کا انتخاب نثر کی نظمیت اور موسیقیت میں کمی اور بیشی کا باعث ہوتا ہے۔ نظم میں بحر بھی ہوتی ہے اور نظم کی اقسام کے حساب سے دیگر لوازمات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔

نظم کی اقسام ہیں پابند نظم، آزاد نظم، نظم معرّیٰ اور نثری نظم

پابند نظم: پابند نظم میں وزن بحر ردیف اور قافیہ سب موجود ہوتا ہے یہ غزل کے اوزان پر کہی جا سکتی ہے لیکن اس کی سب اصناف میں غزل کی بحریں استعمال نہیں کی جا سکتیں۔ اس کی مختلف اصناف میں قصیدہ، مرثیہ، گیت، سانیٹ، پیروڈی، مثنوی، رباعی، قطعہ۔ مسمط، مثلث، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، مثمن اور مستزاد وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے ان میں سے بیشتر کے بند میں مصرعوں کی تعداد میں فرق ہوتا ہے۔ رباعی کے لیے مخصوص بحروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں صرف گیت ایسا ہے جس کی کوئی خاص ہیئت نہیں ہے۔

آزاد نظم: آزاد نظم شاعری کی ایک بہت خوبصورت صنف ہے اس طرح کی نظموں کا ایک اپنا مزہ ہے۔ ان میں ترنم ہوتا ہے۔ اس نوع کی نظموں کو آزاد تو کہا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ مادر پدر آزاد ہیں۔ ان نظموں میں بحر کی پابندی لازم ہے لیکن ردیف اور قافیہ کی قید نہیں ہے۔

آزاد نظم میں اور نظم معرّیٰ میں بنیادی فرق وزن کا فرق ہے۔ آزاد نظم میں وزن کی کمی بیشی جائز ہے۔ مثلاً اگر ایک بحر استعمال کی گئی ہے تو اس کے تمام ارکان ہر مصرعے میں استعمال کرنا ضروری نہیں۔ مثال کے طور پر فاعلاتن فاعلاتن فاعلن کی بحر ہے تو اس کے وزن میں ہر دوسرے مصرعے میں ارکان زیادہ یا کم کئے جاسکتے ہیں۔ جیسے کہ فاعلاتن فاعلاتن فاعلن، فاعلاتن فاعلاتن، فاعلاتن فاعلن، فاعلاتن فاعلاتن فاعلن، فاعلاتن فاعلاتن فاعلن وغیرہ بعض شعرا بحر میں تبدیلی کرتے ہیں اس میں بعض تو جدیدیت کے شوق میں کچھ نیا تخلیق کرنے کے شوق میں جان بوجھ کر بحر میں تبدیلی کرتے ہیں اور بعض غلطی سے بحروں پر کم عبور ہونے کے سبب اس غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لیکن نظم کے ایک دو مصرعے میں بحر تبدیل کرنے کی گنجائش بہر حال بدرجہ اتم موجود ہے۔ گرچہ کہ یہ بحر بدلنے کا عمل قاری کی طبیعت پر گراں بلکہ ناگوار تاثر چھوڑتا ہے۔ نظم معرّیٰ: نظم معرّیٰ انگریزی ادب سے اردو ادب میں آئی۔ معرّیٰ کا مطلب ہے پاک صاف۔ خالی، آزاد، عریاں، خالص۔ لیکن یہ اسی حد تک پاک صاف یا آزاد ہے کہ اس میں ردیف اور قافیہ استعمال نہیں کیا جاتا لیکن بحر سے آزاد ہے نہ وزن سے۔ نظم معرّیٰ میں تمام اشعار ہم وزن ہوتے ہیں اور شروع تا آخر ایک بحر میں ہوتے ہیں۔ اور ترنم میں ہوتے ہیں۔ ایک بحر میں اور ایک وزن سے مراد یہ ہے کہ جو بھی بحر پہلے مصرعے میں استعمال کی جائے اس میں کسی دوسرے مصرعے میں بھی کوئی کمی بیشی نہ کی جائے۔ اول تا آخر ایک ہی بحر ایک ہی وزن میں استعمال ہوتی ہے مثلاً فاعلاتن فاعلاتن فاعلن (پہلا مصرعہ بلکہ ہر مصرعہ) فاعلاتن فاعلاتن فاعلن (آخری مصرعہ) ایک بحر ایک ہی وزن میں استعمال ہوتی ہے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ ردیف اور قافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی۔ ہر مصرعہ الگ قافیہ ردیف میں ہوتا ہے لیکن پوری نظم اول تا آخر ایک موضوع سے جڑی ہوتی ہے۔ غزل کی طرح ہر شعر کا موضوع الگ نہیں کیا جاسکتا۔

نظم معرّیٰ میں ہر مصرعے میں وہی بحر استعمال ہوتی ہے جو کہ پہلے مصرعے میں استعمال کی گئی ہو۔ لیکن آزاد نظم کی طرح اس کے مصرعوں میں دوسری بحر کے دخول کی اجازت نہیں۔ نثری نظم: جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا۔ نثری نظم کی بڑے شعرا یعنی اساتذہ کی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی بحر سرے سے استعمال ہی نہیں کی جاتی۔ یہ غیر شاعر افراد کے ابلاغ کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن جو افراد عروض نہیں جانتے لیکن شاعری کا شوق رکھتے ہیں وہ نثری نظم کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن نثری نظم کے بھی کچھ اصول ہونے چاہیئں۔ یہاں کچھ اصول دیئے جا رہے ہیں۔ شاعری کے شوقین حضرات کم از کم ان اصولوں پر عمل کریں۔ نثری نظم اول تا آخر ایک ہی موضوع پر ہونا چاہیئے۔ کہیں کہیں ردیف اور قافیہ کے استعمال سے نغمگی پیدا کی جائے۔ اول تا آخر نظم ترنم میں محسوس ہو۔ نظم کا ہر مصرعہ دوسرے مصرعے سے جڑا ہو۔ آج کل تجرید کے شوق میں اور خود کو انٹلیکچوئل ثابت کرنے کے چکر میں لوگ ایک جملے میں ایک بات کہتے ہیں اور دوسرے مصرعے میں دوسری۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا..... بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

اس طرح کی شاعری کرنے والوں کو پتہ ہونا چاہیئے کہ شاعری کے اساتذہ ہی نہیں بلکہ عام قاری بھی بے وقوف نہیں ہے۔ میں بنیادی طور پر نثری شاعری کے خلاف نہیں ہوں۔ لیکن نثری شاعری اس طرح کی ہونا چاہیئے کہ اگر اس کا ترجمہ کسی اور زبان میں کیا جائے تو ایک بامقصد تحریر سامنے آئے۔

گھروں کی کیفیات

ڈاکٹر منور احمد کنڈے

چار طرح کے گھر ہوتے ہیں۔ وہ گھر جن میں نہ گائے بھینس ہوتی ہے۔ نہ بکری۔ نہ بیل۔ ایسے گھر دودھ دہی چھاچھ وغیرہ کے لئے دوسروں کے پاس جاتے ہیں۔ وہ گھر جن میں صرف بیل ہوتے ہیں۔ ان کے گھروں میں بھی دودھ دہی چھاچھ وغیرہ نہیں ہوتے مگر بیلوں کی وجہ سے لوگوں کو ان کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ وہ گھر جن میں گائے یا بھینس ہوتی ہے۔ ان کے گھر سے لوگ دودھ دہی چھاچھ مکھن وغیرہ لیتے رہتے ہیں۔۔ وہ گھر جن میں گائے بھینس بکری بیل سب ہوتے ہیں۔ ان گھروں کو زیادہ خوشحال اور سخی سمجھا جاتا ہے۔ وہ دودھ دہی مکھن وغیرہ کے محتاج نہیں ہوتے۔ یہ مثالیں صرف گھروں کے لئے ہی نہیں ہیں۔ انفرادی طور پر انسانوں کے لئے بھی ہیں۔ سب سے بڑھ کر ملکوں کے لئے ہیں۔ بکریاں بھیسنیں گائے بیل یہ سب استعارے ہیں۔ ان کی حقیقتوں کو سمجھ کر ترقی کے راستوں پر قوموں کو مل جل کر مسلسل چلنا پڑتا ہے تب ہی خوشحالی ملکوں کا مقدر بنتی ہے۔ جہاں اکتا نہیں ہے وہاں بکری ہے نہ بھینس۔ نہ گائے نہ بیل۔ وہ قوم ہی بدنصیب ہے جو ترقی کے راستوں سے بھٹک چکی ہے۔

پاکستان کی تاریخ کے وہ اوراق
جو ہمیں کتابوں میں نہیں پڑھائے جاتے۔ (رجل خوشاب)

قیامِ پاکستان کے کچھ عرصے بعد سردار عبدالرب نشتر نے ایوب خان کے بارے میں ایک فائل قائداعظم کو بھجوائی تو ساتھ نوٹ میں لکھا کہ ایوب خان مہاجرین کی بحالی اور ریلیف کے بجائے سیاست میں دلچسپی لیتا ہے اس پر قائداعظم نے فائل پر یہ آرڈر لکھا:

''میں اس آرمی افسر (ایوب خان) کو جانتا ہوں۔ وہ فوجی معاملات سے زیادہ سیاست میں دلچسپی لیتا ہے۔ اس کو مشرقی پاکستان ٹرانسفر کیا جاتا ہے۔ وہ ایک سال تک کسی کمانڈ پوزیشن پر کام نہیں کرے گا اور اس مدت کے دوران بیج نہیں لگائے گا۔''

بحوالہ: کتاب: قائداعظم بحیثیت گورنر جنرل مصنف: قیوم نظامی

قائداعظم کا ایوب خان کے بارے میں غصہ بعد میں بھی ٹھنڈا نہ ہوا اور جب وہ ڈھاکہ گئے اور انھیں فوجی سلامی دی گئی تو انھوں نے ایوب خان کو اپنے ساتھ کھڑے ہونے سے روک دیا۔

بحوالہ: کتاب: گوہر گزشت مصنف: الطاف گوہر

دراصل تقسیم کے زمانے میں امرتسر میں ہندو مسلم فسادات پر قابو پانے کے لیے ایوب خان کو ذمہ داری سونپی گئی تھی مگر وہ وہاں جا کر مہاراجہ پٹیالہ کی محبوبہ پر عاشق ہو گئے اور اپنا بیشتر وقت اسکے ساتھ گزارنے لگے اور فسادات پہ کوئی توجہ نہیں دی۔ جس پر قائداعظم نے سزا کے طور پر انکو ڈھاکہ بھیجا تھا۔

بحوالہ: کتاب: گوہر گزشت مصنف: الطاف گوہر

اپنی اس تنزلی پر ایوب خان بہت رنجیدہ ہوئے اور انہوں نے قائد اعظم کے احکامات کے برخلاف اسوقت کے فوجی سربراہ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس حوالے سے انہوں نے اپنے دوست بریگیڈیئر شیر علی خان پٹودی سے مدد مانگی۔ شیر علی خان پٹودی پہلی فرصت میں کراچی سے راولپنڈی گئے اور کمانڈر انچیف سر فرینک میسروی سے اپنے دوست کی سفارش کی لیکن بات بنی نہیں۔ بحوالہ: کتاب: گوہر گزشت مصنف: الطاف گوہر

لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ جس ایوب خان سے قائداعظم اسقدر نالاں تھے اسی ایوب خان کو لیاقت علی خان نے اسوقت کے سینئر ترین جنرل، جنرل افتخار پر فوقیت دے کر فوج کا سربراہ بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس حوالے سے بھی انکے دوست بریگیڈیئر شیر علی خان پٹودی اور دیگر رفقاء نے اہم کردار ادا کیا۔ اور بدنصیبی دیکھئے، وہی ایوب خان پاکستان کا پہلا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا اور پاکستان پر گیارہ سال تک حکومت کرتا رہا۔

بحوالہ: کتاب: The Crossed Sword مصنف: شجاع نواز

قائداعظم خاص جمہوری انداز میں مملکت چلانا چاہتے تھے۔ اور اسی حوالے سے کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔ اس حوالے سے قائداعظم نے ایک اور فوجی افسر اکبر خان کے مشوروں سے زچ ہو کر اس سے کہا تھا کہ آپ کا کام پالیسی بنانا نہیں، حکومت کے احکامات کی تعمیل کرنا ہے۔ اور بعد ازاں وہی جنرل اکبر لیاقت علی خان کے خلاف بغاوت کے جرم میں گرفتار ہوا اور تقریباً پانچ سال جیل میں رہا۔

اور بدنصیبی دیکھئے، عدالت سے غداری کی سزا کاٹنے والے، اسی جنرل اکبر کو 1973 میں بھٹو صاحب، قومی سلامتی کونسل کا رکن نامزد کر دیتے ہیں۔

بحوالہ: کتاب: قائداعظم بحیثیت گورنر جنرل مصنف: قیوم نظامی

بانی پاکستان جون 1948 میں سٹاف کالج کوئٹہ گئے تو وہاں گفتگو کے دوران انکو اندازہ ہوا کہ اعلیٰ فوجی افسران اپنے حلف کے حقیقی معنوں سے واقف نہیں ہیں۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی لکھی ہوئی تقریر ایک طرف رکھ کے فوجی افسران کو یاددہانی کے طور پر ان کا حلف پڑھ کر سنایا، اور انہیں احساس دلایا کہ انکا کام حکم دینا نہیں صرف حکم ماننا۔

بحوالہ: کتاب: قائداعظم بحیثیت گورنر جنرل مصنف: قیوم نظامی

بعد کے ادوار میں فوجی جرنیلوں نے اس حلف کی اتنی خلاف ورزی کی کہ ائیر مارشل اصغر خان کو لکھنا پڑا کہ میری تجویز ہے کہ اگر ہم پر جرنیلوں ہی نے حکمرانی کرنی ہے تو یہ الفاظ حلف سے حذف کر دیئے جائیں: ''میں کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں، خواہ ان کی نوعیت کچھ بھی ہو، حصہ نہیں لوں گا۔''

بحوالہ کتاب: جنرل اور سیاست مصنف: اصغر خان

جنرل گریسی جب اپنے پیشہ ورانہ دورے پر لاہور گئے تو کرنل ایوب کو دیکھا اور بلا کو پوچھا کہ آپ کو تو ڈھاکہ میں رپورٹ کرنی تھی تو آپ یہاں کیا کر رہے ہیں جس پر ایوب خان نے کہا کہ وہ کراچی لیاقت علی خان سے ملنے جا رہے ہیں۔ اس پر جنرل گریسی نے ایوب کے کورٹ مارشل کے آرڈر کیئے اور انہیں اپنے ساتھ کراچی لے آئے۔

بحوالہ میموریز آف اے سولجر۔ جنرل وجاہت حسین، سیکریٹری جنرل گریسی

حاصلِ کلام: جس دن ہم نے اپنی نئی نسل کو پاکستان کی اصل تاریخ پڑھانا شروع کر دی اسی دن سے پاکستان ترقی کرنا شروع کر دے گا۔

تذکیروتانیث

ابن لطیف

کیا آپ کو مچھلی کا مذکر معلوم ہے؟

جب ہم چھوٹے تھے تو ہمیں یہ اصول معلوم نہیں تھا کہ الف پر ختم ہونیوالے مذکر کو مؤنث بنانا ہوتو اسکی آخری 'الف' کو چھوٹی 'ی' میں بدل دیتے ہیں لیکن اسکے باوجود ہم مرغا مرغی، بکرا بکری، گدھا گدھی یا گھوڑا گھوڑی کے معاملے میں کوئی غلطی نہیں کرتے تھے۔البتہ جب چڑا چڑی اور کُتا کُتی تک بات پہنچتی تو استاد کا غضبناک چہرہ دیکھنا پڑتا اور تذکیروثانیت کے وہ معصوم سے اصول جو ہم نے لاشعوری طور پر اپنا رکھے تھے، دُھواں بن کر اُڑ جاتے۔ اِس بات کا منطقی جواب کوئی نہیں دیتا تھا کہ چڑی کو چڑیا اور کُتّی کو کُتّیا کہنا کیوں ضروری ہے۔ذرا اور بڑے ہوئے تو معلوم ہوا کہ تذکیروثانیت کی دنیا تو پوری اندھیر نگری ہے۔ وہاں نر اور مادہ کے اصولوں کی کھُلی خلاف ورزیاں ہوتی ہیں۔مثلاً کوّا، اُلو، ہُدہُد، خرگوش، لنگور، گِدھ، کچھوا اور مچھّر کے بارے میں پتہ چلا کہ اِن بے چاروں کی مؤنث شکل تو موجود ہی نہیں ہے۔

دِل میں بار بار خیال آتا کہ مسٹر خرگوش کے گھر میں کوئی مسز خرگوش بھی تو ہو گی۔لنگور کی بیوی، گِدھ کی ماں، کچھوے کہ بہن۔کیا یہ سب ہستیاں وجود ہی نہیں رکھتیں؟ اور اگر ہیں تو اُن کیلئے الگ سے الفاظ کیوں موجود نہیں۔ اِس نا انصافی اور زیادتی پر ایک بار بہت گڑگڑا کر اپنے اُستاد سے سوال کیا تو وہ غصے سے لال ہوکر بولے، بے انصافی تو دونوں طرف سے ہے۔مچھلی کے شوہر کا نام سنا ہے کبھی؟ وہ بھی تو وجود رکھتا ہے۔ہم لاجواب ہوگئے اور اُستاد جی نے پوری فہرست گِنوا دی فاختہ، مینا، چیل، مُرغابی، ابابیل، مکھی، چھپکلی۔استاد جی نے الٹا ہمیں سوال داغ دیا بتاؤ: کیا اِن سب کے باپ بھائی وجود نہیں رکھتے؟ اور آج تک اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہے ہیں...کوئی اہل علم مدد فرمائیں۔(منقول)

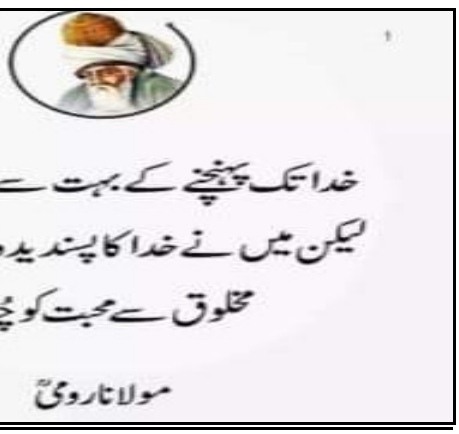

آفتاب شاہ

❁ - لوگ گندگی سے کترا کر اس لیے نہیں گزرتے کہ اس میں کوئی خوبی، جرات، بہادری یا طاقت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ یا گند کوئی اپنی شان رکھتا ہے۔گند کی خوبی گند کی نظر میں بھی لوگوں کو گندہ کرنا ہی ہے نیکی اور پاکی کو نجاست سے بھرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔اسی لیے نفاست پسند اور نیک خصلت لوگ گندگی سے دور رہتے ہیں لیکن بدخصلت اپنی گندی سوچ اور اوچھے ہتھکنڈوں کو اپنی فتح قرار دیتا ہے۔جبکہ وہ یہ نہیں جانتا کہ گند میں منہ مارنے کا شوق کسی جانور کا تو ہوسکتا ہے نسلی انسان کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

❁ - سوچ کا کنواں جب بے حسی کی ریت سے بھر جاتا ہے تو خیالات کی پچکاریاں دم گھٹنے سے ابلنے لگتی ہیں جس سے جذبات کی سرانڈ حبس کی ہوا سے مل کر تعمیر کا مریل جسم گھسیٹتی پھرتی ہے۔روح کی موت کا اعلان زندگی کی تربت میں تب ہی ہوجاتا ہے جب معصومیت کا گلہ گھونٹ کر سچائی کو جھوٹ کا زہر پلا کر سقراط کے ہم پلہ قرار دیا جاتا ہے۔خاک کا پتلہ نفس کی آگ میں جل کر اگر ریاکاری کا لباس زیب تن کرلے تو شیطان کو بھی دھوکہ دینا آسان ہوجاتا ہے۔

❁ - آزمائش انسان کو مضبوط کرنے آتی ہے اور یہی مصیبت بہت سے چہروں کو عیاں کر کے رخصت ہوجاتی ہے تو کل سے ناآشنا لوگ چھوٹی سی تکلیف پر شرک کی منزل پر پہنچ جاتے ہیں اور جب وہ ایسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جو تکبر سے بندھے ہوتے ہیں تو گمان گزرتا ہے کہ نیکی، خوبی اور کامیابی ان کے اپنے دم قدم سے تھی جبکہ مصیبت خدا کی طرف سے ہے پھر کہتے ہیں اب کیا ہوگا؟ کون رزق دے گا؟ دکھ کون کم کرے گا؟ جبکہ وہ یہ نہیں جانتے دکھ اور سکھ اسی ذات کی جانب سے ہیں جو اپنے بندوں کی تڑپ پر بیقرار ہوجاتا ہے شرط بس یقین کی ہے۔

❁ - عام فرد کے بہت سے مسائل اس کے اپنے پیدا کردہ ہوتے ہیں جن سے وقت بیوقت وہ پریشان ہوکر دوسروں کی زندگی بھی اجیرن کرتا رہتا ہے۔جب واٹس ایپ، فیس بک، ٹویٹر اور ہزاروں مختلف موبائل ایپ اور خود موبائل نہیں تھا تب بھی زندگی گزرتی تھی۔لیکن جدت نے جو سب سے بڑا ظلم عام فرد پر کیا وہ یہ تھا کہ خاص چیزوں کو اتنا عام کردیا کہ ان اشیاء کے بغیر زندگی

گزارے کا تصور معدوم ہوتا چلا گیا۔ بڑی گاڑی اگر دسترس میں نہ ہو تو افسوس نہیں ہوتا لیکن اچھا موبائل پاس نہ ہو تو نیند روٹھ جاتی ہے۔

موبائل کے ساتھ نیٹ اور نیٹ کے ساتھ وقت بھی اب سستا ترین دستیاب ہے لیکن صرف وہاں جہاں سروس کی سہولت موجود ہو اور یہ سروس ایسی ہے جس نے افراد کو دور کر کے نیٹ ورکس کو جوڑ دیا ہے۔

❁ - دکھ اور سکھ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں جس طرح زندگی سچ اور جھوٹ سے جڑی ہے اسی طرح غم اور خوشی بھی زیست کا حصہ ہیں۔ عام طور پر غم اور دکھ کا واویلا اس طرح کیا جاتا ہے جس طرح آفات خداوندی یا عذابِ الٰہی کی پکڑ میں اچانک آ گئے ہوں حقیقتاً ایسا نہیں ہے انسان کو اپنے اعمال اور حرکات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ایک غم وہ ہے جو انسان خود اپنے لیے تیار کرتا ہے۔ یہ غم محبت اور غلط توقعات سے پیدا ہوتا ہے اور دوسرا غم وہ ہے جو ربِ کائنات کی جانب سے جھنجھوڑنے کے لیے ہوتا ہے۔ سمجھدار اور توکل سے جڑے لوگ قبولیت کا اظہار سر کو جھکا کر کرتے ہیں اور کم ظرف گلے شکوہ میں زندگی گزار دیتے ہیں حالانکہ دکھ اور سکھ کا دورانیہ ایک جیسا ہوتا ہے۔

❁ - کیا عجیب لوگ ہیں جو چار جملے ڈھنگ کے لکھ نہیں سکتے لیکن کسی کی تحریر کو اپنا بنا کر شملہ اونچا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اکبر بھٹی، شبانہ بیگم، افضال حسین، ریحان حسین، خاور حسین اور ایک لمبی قطار جو تحریر کو اس مہارت سے چوری کرتے ہیں کہ لکھاری کا نام کاٹ کر خود کو تحریر کے ایفل ٹاور پر بٹھا دیتے ہیں۔ افسوس صد افسوس! ادب سے اخلاقیات کا جنازہ نکل گیا۔ ادب کے چوروں اگر لکھاری کو اس کا حق نہیں دے سکتے تو اپنا نام بھی مت دو۔ اگر کوئی فرد ڈھنگ کے چار جملے جوڑ نہیں سکتا تو اس کو یہ حق بھی نہیں کہ وہ کسی کی ڈھنگ کی تحریر اپنی جاگیر بنا لے۔ ادب کا چور ہمیشہ پکڑا جاتا ہے کیونکہ چوری کا مال اصل مالک تک پہنچ ہی جاتا ہے۔

❁ - جس طرح کڑوے بادام کی کڑواہٹ کو میٹھے بادام کی نرمی سے کم کیا جا سکتا ہے اسی طرح غضب ناک لہجوں اور غصیلے رویوں کو اپنی شیریں بیانی اور صبر کی مٹھاس سے نہ صرف کم کیا جا سکتا ہے بلکہ رشتوں کی ڈور کو مضبوط بھی کیا جا سکتا ہے تحمل اور برداشت رشتوں کی عمر میں اضافہ کر دیتے ہیں ہمارے ہاں برداشت کی بجائے بزدلی سکھائی جاتی ہے اور غیرت کی بجائے جبر سکھایا جاتا ہے سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جو استاد اور والد صبر اور برداشت پر طویل خطبے ارشاد فرمائیں وہ ہی بے صبری میں مار مار کر بچوں کا بھرکس نکال دیتے ہیں۔

❁ - جو شخص ہر ایک کے لیے دستیاب ہوتا ہے عمومی طور پر اسے بیکار سمجھا جاتا ہے اور جو کبھی کبھار کسی کے کام آ جائے تو اسے نواب سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے کی عادات انتہائی عجیب فلسفے پر ٹھہری ہوئی ہیں اگر کوئی مشورہ دینے کا مجرم بن جائے تو اس سے امید کی جاتی ہے کہ اب مسئلہ بھی یہی حل کرے گا۔ شادی بیاہ پر کوئی نہ کوئی رشتے دار ایسا ضرور ہوتا ہے جو ناراضی کو اپنا حق سمجھتا ہے جبکہ ناراض ہونے والے صاحب کے گھر اگر تقریب ہو تو وہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ کوئی بھی بدمزگی کا لمحہ انہیں دیکھنا پڑے۔ ہم سب لائن میں لگنے کو بہت اچھا سمجھتے ہیں لیکن لائن میں لگنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ حقیقت میں قانون اور اخلاقیات جب تک خود سے شروع نہیں ہونگیں تب تک ہماری اصلاح ممکن نہیں۔

❁ - کہانی کار کسی بھی کہانی کو ذہن کے قرطاس پر بکھیرنے سے پہلے اس کے اسباب اور اثرات پر اگر غور نہ کرے تو تخلیق کا عمل سوقیاتی رنگ سے جڑنے کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ ڈرامہ نگار جب عوام کو شادی کی حرمت کی بجائے طلاق کی افادیت پر قائل کرنا شروع کر دے تو رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے کسی پروپیگنڈہ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جب ایک اشہار بنانے والا عورت کو بکاؤ چیز دکھائے تو عورت کی عزت کا سودا سرِ بازار شروع ہو جاتا ہے۔ جب ایک بالغوں والا سین کم عمر بچے دیکھتے ہیں تو پہلے باپ اور پھر ماں سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہے تو تربیت کے ٹھیکدار پسینے میں شرابور ہو جاتے ہیں۔ ضروری نہیں ہر بات کو بیان کیا جائے یا دکھایا جائے کچھ باتیں پردے میں رہ کر بھی بے پناہ اثر رکھتی ہیں۔ ضرورت صرف نکتہ نظر کو بدلنے کی ہے۔

ژ - ایک لطیفے پر تادیر ہنسا نہیں جا سکتا کیونکہ اس لطیفے کی رعنائی اور اثر صرف ایک پہلو تک محدود ہوتا ہے اس لیے دوسری یا تیسری دفعہ سننے پر اس مذاق سے طبیعت اُکتا جاتی ہے جبکہ ایک دکھ اور غم ہمیشہ رلانے کی صلاحیت رکھتا ہے حقیقت میں وہ دکھ یا غم صرف ایک پہلو نہیں رکھتا۔ وہ اپنے اندر ہزاروں ایسی باتیں رکھتا ہے جس پر روز رونا بھی کم پڑ جاتا ہے۔ کسی مرنے یا بچھڑنے والی کی یاد، اسی کی دلنشین باتیں، اس کا حسین ساتھ، اس کا لڑنا، روٹھنا، منانا، پیار کرنا، اظہار کرنا اور محبت کا جذباتی تعلق جب جب یاد آتا ہے آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں۔ انسان اگر بے حس نہیں تو کسی کا غم اس کی آنکھوں کو نم ضرور رکھے گا۔

***

یہ دنیا ایک امتحان ہے

عاصی صحرائی

کہتے ہیں کہ ہارون رشیدؒ کا ایک بیٹا تھا جس کی عمر تقریباً سولہ سال کی تھی۔ وہ بہت کثرت سے زاہدوں اور بزرگوں کی مجلس میں رہا کرتا تھا، اور اکثر قبرستان چلا جاتا، وہاں جا کر کہتا کہ تم لوگ ہم سے پہلے دنیا میں تھے، دنیا کے مالک تھے، لیکن اس دنیا نے تمھیں نجات نہ دی، حتیٰ کہ تم قبروں میں پہنچ گئے۔ کاش! مجھے کسی طرح خبر ہوتی کہ تم پر کیا گذری ہے اور تم سے کیا کیا سوال و جواب ہوئے ہیں؟ اور اکثر یہ شعر پڑھا کرتا۔

تَرُوْعُنِیَ الْجَنَائِزُ کُلَّ یَوْمٍ وَیَجْزُنُنِیْ بُکَاءُ النَّائِحَات

مجھے جنازے ہر دن ڈراتے ہیں اور مرنے والوں پر رونے والیوں کی آوازیں مجھے غمگین رکھتی ہیں۔ ایک دن،،،،، وہ اپنے باپ (بادشاہ) کی مجلس میں آیا۔ اس کے پاس وُزرا، اُمرا سب جمع تھے اور لڑکے کے بدن پر ایک کپڑا معمولی اور سر پر ایک لنگی بندھی ہوئی تھی۔ آراکینِ سلطنت آپس میں کہنے لگے کہ اس پاگل لڑکے کی حرکتوں نے امیر المومنین کو بھی دوسرے بادشاہوں کی نگاہ میں ذلیل کر دیا۔ اگر امیر المومنین اس کو تنبیہ کریں تو شاید یہ اپنی اس حالت سے باز آجائے۔ امیر المومنین نے یہ بات سن کر اس سے کہا کہ بیٹا! تو نے مجھے لوگوں کی نگاہ میں ذلیل کر رکھا ہے۔ اس نے یہ بات سن کر باپ کو تو کوئی جواب نہیں دیا، لیکن ...ایک پرند وہاں بیٹھا تھا اس کو کہا کہ اس ذات کا واسطہ جس نے مجھے پیدا کیا تو میرے ہاتھ پر آ کر بیٹھ جا۔ وہ پرندہ وہاں سے اُڑ کر اس کے ہاتھ پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر کہا کہ اب اپنی جگہ چلا جا۔ وہ ہاتھ پر سے اُڑ کر اپنی جگہ چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے عرض کیا کہ ابا جان! اصل میں آپ دنیا سے جو محبت کر رہے ہیں اس نے مجھے رُسوا کر رکھا ہے۔۔!!! اب میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ آپ سے جدائی اختیار کر لوں۔

یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا اور ایک قرآن شریف صرف اپنے ساتھ لیا۔ چلتے ہوئے ماں نے ایک بہت قیمتی انگوٹھی بھی اس کو دے دی (کہ اِحتیاج کے وقت اس کو فروخت کر کے کام میں لائے) وہ یہاں سے چل کر۔۔۔ بصرہ پہنچ گیا... اور مزدوروں میں کام کرنے لگا۔ ہفتہ میں صرف ایک دن شنبہ کو مزدوری کرتا اور آٹھ دن تک وہ مزدوری کے پیسے خرچ کرتا اور آٹھویں دن پھر شنبہ کو مزدوری کر لیتا۔ اور ایک دِرَہم اور ایک دانق (یعنی دِرَہم کا چھٹا حصہ مزدوری لیتا) اس سے کم یا زیادہ نہ لیتا۔ ایک دانق روزانہ خرچ کرتا۔ ابو عامر بصریؒ کہتے ہیں کہ میری ایک دیوار گر گئی تھی۔ اس کو بنوانے کے لیے میں کسی معمار کی تلاش میں نکلا۔ (کسی نے بتایا ہوگا کہ یہ شخص بھی تعمیر کا کام کرتا ہے) میں نے دیکھا کہ نہایت خوبصورت لڑکا بیٹھا ہے، ایک زنبیل پاس رکھی ہے اور قرآن شریف دیکھ کر پڑھ رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ لڑکے مزدوری کرو گے؟ کہنے لگا: کیوں نہیں! کریں گے، مزدوری کے لیے تو پیدا ہی ہوئے ہیں۔ آپ بتائیں کہ کیا خدمت مجھ سے لینی ہے؟ میں نے کہا: گارے مٹی (تعمیر) کا کام لینا ہے۔ اس نے کہا کہ ایک دِرَہم اور ایک دانق مزدوری ہوگی اور نماز کے اوقات میں کام نہیں کروں گا، مجھے نماز کے لیے جانا ہوگا۔ میں نے اس کی دونوں شرطیں منظور کر لیں اور اس کو لا کر کام پر لگا دیا۔ مغرب کے وقت جب میں نے دیکھا تو اس نے دس آدمیوں کی بقدر کام کیا۔ میں نے اس کو مزدوری میں دو دِرَہم دیئے۔ اس نے شرط سے زائد لینے سے انکار کر دیا، اور ایک دِرَہم اور ایک دانق لے کر چلا گیا۔ دوسرے دن۔۔۔ میں پھر اس کی تلاش میں نکلا۔ وہ مجھے کہیں نہ ملا۔ میں نے لوگوں سے تحقیق کیا کہ ایسی ایسی صورت کا ایک لڑکا مزدوری کیا کرتا ہے، کسی کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ملے گا؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ صرف شنبہ ہی کے دن مزدوری کرتا ہے، اس سے پہلے تمھیں کہیں نہیں ملے گا۔ مجھے اس کے کام کو دیکھ کر ایسی رغبت ہوئی کہ میں نے آٹھ دن کو اپنی تعمیر بند کر دی اور شنبہ کے دن اس کی تلاش کو نکلا۔ وہ اسی طرح بیٹھا قرآن شریف پڑھتا ہوا ملا۔ میں نے سلام کیا اور مزدوری کرنے کو پوچھا۔ اس نے وہی پہلی دو شرطیں بیان کیں۔ میں نے منظور کر لیں۔ وہ میرے ساتھ آ کر کام میں لگ گیا۔ مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ پچھلے شنبہ کو اس اکیلے نے دس آدمیوں کا کام کس طرح کر لیا۔ اس لیے اس مرتبہ میں نے اُسی طرح چھپ کر کہ وہ مجھے نہ دیکھے، اس کے کام کرنے کا طریقہ دیکھا،... تو یہ منظر دیکھا کہ... وہ ہاتھ میں گارا لے کر دیوار پر ڈالتا ہے اور پتھر اپنے آپ ہی ایک دوسرے کے ساتھ جڑتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اللہ کا ولی ہے اور اللہ کے اَولیا کے کاموں کی غیب سے مدد ہوتی ہی ہے۔ جب شام ہوئی تو میں نے اس کو تین دِرَہم دینا چاہے۔ اس نے لینے سے انکار کر دیا کہ میں اتنے دِرَہم کیا کروں گا؟ اور ایک دِرَہم اور ایک دانق لے کر چلا گیا۔ میں نے ایک ہفتہ پھر انتظار کیا اور تیسرے شنبہ کو پھر میں اس کی تلاش میں نکلا، مگر وہ مجھے نہ ملا۔ میں نے لوگوں سے تحقیق کیا۔ ا۔ ایک شخص نے بتایا کہ

وہ تین دن سے بیمار ہے... فلاں ویرانہ جنگل میں پڑا ہے۔ میں نے ایک شخص کو اُجرت دے کر اس پر راضی کیا کہ وہ مجھے اس جنگل میں پہنچا دے۔ وہ مجھے ساتھ لے کر اس جنگل ویران میں پہنچا تو میں نے دیکھا... وہ بے ہوش پڑا ہے۔ آدھی اینٹ کا ٹکڑا سر کے نیچے رکھا ہوا ہے۔ میں نے اس کو سلام کیا، اس نے جواب نہ دیا۔ میں نے دوسری مرتبہ سلام کیا تو اس نے (آنکھ کھولی اور) مجھے پہچان لیا۔ میں نے جلدی سے اس کا سر اینٹ پر سے اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے سر ہٹا لیا اور چند شعر پڑھے۔ جن میں سے دو یہ ہیں۔

يَا صَاحِبِيْ لَا تَغْتَرِرْ بِتَنَعُّمٍ فَالْعُمْرُ يَنْفَدُ وَالنَّعِيْمُ
يَزُوْلُ وَإِذَا حَمَلْتَ إِلَى الْقُبُوْرِ جَنَازَةً فَاعْلَمْ بِأَنَّكَ بَعْدَهَا مَحْمُوْل

میرے دوست دنیا کی نعمتوں سے دھوکہ میں نہ پڑ۔ عمر ختم ہوتی جا رہی ہے اور یہ نعمتیں سب ختم ہو جائیں گی۔ جب تو کوئی جنازہ لے کر قبرستان میں جائے تو یہ سوچتا رہا کر کہ تیرا بھی ایک دن اسی طرح جنازہ اُٹھایا جائے گا... اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ ابو عامر! جب میری روح نکل جائے تو مجھے نہلا کر میرے اسی کپڑے میں مجھے کفن دے دینا۔ میں نے کہا: میرے محبوب! اس میں کیا حرج ہے کہ میں تیرے کفن کے لیے نئے کپڑے لے آؤں؟ اس نے جواب دیا کہ نئے کپڑوں کے زندہ لوگ زیادہ مستحق ہیں۔ (یہ جواب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جواب ہے۔ آپ نے بھی اپنے وصال کے وقت یہی فرمائش کی تھی کہ میری انہی چادروں میں کفن دے دینا۔ اور جب ان سے نئے کپڑے کی اجازت چاہی گئی تو آپ نے یہی جواب دیا تھا۔) لڑکے نے کہا کہ کفن تو (پرانا ہو یا نیا بہر حال) بوسیدہ ہو جائے گا۔ آدمی کے ساتھ تو صرف اس کا عمل ہی رہتا ہے۔ اور یہ میری لنگی اور لوٹا قبر کھودنے والے کو مزدوری میں دے دینا، اور یہ انگوٹھی اور قرآن شریف ہارون رشید تک پہنچا دینا۔ اور اس کا خیال رکھنا کہ خود انہی کے ہاتھ میں دینا اور یہ کہہ کر دینا کہ ایک پردیسی لڑکے کی یہ میرے پاس امانت ہے اور وہ آپ سے یہ کہہ گیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اسی غفلت اور دھوکہ کی حالت میں آپ کی موت آ جائے۔

یہ کہہ کر اس کی روح نکل گئی... اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ یہ لڑکا شہزادہ تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی وصیت کے موافق میں نے اس کو دفن کر دیا، اور دونوں چیزیں گورکن کو دے دیں، اور قرآن پاک اور انگوٹھی لے کر... بغداد پہنچا،،، اور قصرِ شاہی کے قریب پہنچا تو بادشاہ کی سواری نکل رہی تھی۔ میں ایک اُونچی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اوّل ایک بہت بڑا لشکر نکلا جس میں تقریباً ایک ہزار گھوڑے سوار تھے اس کے بعد اسی طرح یکے بعد دیگرے دس لشکر نکلے۔ ہر ایک میں تقریباً ایک ہزار سوار تھے۔ دسویں جتھے میں خود امیر المومنین بھی تھے۔ میں نے زور سے آواز دے کر کہا کہ اے امیر المومنین! آپ کو حضورِ اقدس ﷺ کی قرابت رشتہ داری کا واسطہ، ذرا سا توقف کر لیجیے۔ میری آواز پر انھوں نے مجھے دیکھا تو میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا کہ میرے پاس ایک پردیسی لڑکے کی یہ امانت ہے جس نے مجھے یہ وصیت کی تھی کہ یہ دونوں چیزیں آپ تک پہنچا دوں۔ بادشاہ نے ان کو دیکھ کر (پہچان لیا) تھوڑی دیر سر جھکایا۔ ان کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے اور ایک دربان سے کہا کہ اس آدمی کو اپنے ساتھ رکھو، جب میں واپسی پر بلاؤں تو میرے پاس پہنچا دینا۔ جب وہ باہر سے واپسی پر پہنچے تو محل کے پردے گروا کر دربان سے فرمایا: اس شخص کو بلا کر لاؤ، اگرچہ وہ میرا غم تازہ ہی کرے گا۔ دربان میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ امیر المومنین نے بلایا ہے اور اس کا خیال رکھنا کہ امیر پر صدمہ کا بہت اثر ہے۔ اگر تم دس باتیں کرنا چاہتے ہو تو پانچ ہی پر اِکتفا کرنا۔ یہ کہہ کر وہ مجھے امیر کے پاس لے گیا۔ اس وقت امیر بالکل تنہا بیٹھے تھے۔ مجھ سے فرمایا کہ میرے قریب آ جاؤ۔ میں قریب جا کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگے کہ تم میرے اس بیٹے کو جانتے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں میں ان کو جانتا ہوں۔ کہنے لگے: وہ کیا کام کرتا تھا؟ میں نے کہا: گارے مٹی کی مزدوری کرتے تھے۔ کہنے لگے: تم نے بھی مزدوری پر کوئی کام اس سے کرایا ہے؟ میں نے کہا: کرایا ہے۔ کہنے لگے: تمھیں اس کا خیال نہ آیا کہ اس کی حضورِ اقدس ﷺ سے قرابت تھی (کہ یہ حضرات حضور ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد ہیں)؟ میں نے کہا: امیر المومنین پہلے اللہ سے معذرت چاہتا ہوں، اس کے بعد آپ سے عذر خواہ ہوں، مجھے اس وقت اس کا علم ہی نہ تھا کہ یہ کون ہیں؟ مجھے ان کے انتقال کے وقت ان کا حال معلوم ہوا۔ کہنے لگے کہ تم نے اپنے ہاتھ سے اس کو غسل دیا؟ میں نے کہا کہ جی ہاں۔ کہنے لگے: اپنا ہاتھ لاؤ۔ میرا ہاتھ لے کر اپنے سینہ پر رکھ دیا اور چند شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے۔ اے وہ مسافر جس پر میرا دل پگھل رہا ہے اور میری آنکھیں اس پر آنسو بہا رہی ہیں! اے وہ شخص جس کا مکان (قبر) دور ہے، لیکن اس کا غم میرے قریب ہے! بے شک موت ہر اچھے سے اچھے عیش کو مکدر کر دیتی ہے۔ وہ مسافر ایک چاند کا ٹکڑا تھا (یعنی اس کا چہرہ) جو خالص چاندی کی ٹہنی پر تھا (یعنی اس کے بدن پر)۔ پس چاند کا ٹکڑا بھی قبر میں پہنچ گیا اور چاندی کی ٹہنی بھی قبر میں پہنچ گئی۔ اس کے بعد ہارون رشیدؒ نے بصرہ اس کی قبر پر جانے کا

ارادہ کیا، ابو عامرؒ ساتھ تھے۔ اس کی قبر پر پہنچ کر ہارون رشید نے چند شعر پڑھے۔ جن کا ترجمہ یہ ہے اے وہ مسافر جو اپنے سفر سے کبھی بھی نہ لوٹے گا! موت نے کم عمری کے ہی زمانہ میں اس کو جلدی سے اُچک لیا۔ اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک! تو میرے لیے انس اور دل کا چین تھا، لمبی راتوں میں بھی اور مختصر راتوں میں بھی۔ تُو نے موت کا وہ پیالہ پیا ہے جس کو عنقریب تیرا بوڑھا باپ بڑھاپے کی حالت میں پیئے گا۔ بلکہ دنیا کا ہر آدمی اس کو پیئے گا، چاہے وہ جنگل کا رہنے والا ہو یا شہر کا رہنے والا ہو۔

پس سب تعریفیں اسی وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ کے لیے ہیں جس کی لکھی ہوئی تقدیر کے یہ کرشمے ہیں۔ ابو عامرؒ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جو رات آئی تو جب میں اپنے وظائف پورے کر کے لیٹا ہی تھا کہ میں نے خواب میں... ایک نور کا قبہ دیکھا جس کے اوپر اَبر کی طرح نور ہی نور پھیل رہا ہے۔ اس نور کے اَبر میں سے اس لڑکے نے مجھے آواز دے کر کہا: ابو عامر!! تمھیں حق تعالیٰ شانہٗ جزائے خیر عطا فرمائے (تم نے میری تجہیز و تکفین کی اور میری وصیت پوری کی)۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میرے پیارے! تیرا کیا حال گزرا؟ کہنے لگا کہ میں ایسے مولیٰ کی طرف پہنچا ہوں جو بہت کریم ہے اور مجھ سے بہت راضی ہے۔ مجھے اس مالک نے وہ چیزیں عطا کیں جو نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کان نے سنیں، نہ کسی آدمی کے دل پر ان کا خیال گزرا۔ (یہ ایک مشہور حدیثِ پاک کا مضمون ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ کا پاک ارشاد ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی چیزیں تیار کر رکھی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھی، نہ کان نے سنی، نہ کسی کے دل پر ان کا خیال گزرا) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ تورات میں لکھا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے ان لوگوں کے لیے جن کے پہلو رات کو خواب گاہوں سے دور رہتے ہیں (یعنی تہجد گذاروں کے لیے) وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کان نے سنا، نہ کسی آدمی کے دل پر ان کا خیال گذرا، نہ ان کو کوئی مقرب فرشتہ جانتا ہے، نہ کوئی نبی رسول جانتا ہے۔ اور یہ مضمون قرآنِ پاک میں بھی ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَھُمْ مِنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ (السجدہ) کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لیے خزانہء غیب میں موجود ہے۔ (دُرِّ منثور) اس کے بعد... اس لڑکے نے کہا کہ حق تعالیٰ شانہ نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ جو بھی دنیا سے اس طرح نکل آئے جیسا میں نکل آیا، اس کے لیے یہ سب کچھ ہے۔

***

تاریخ کے اوراق سے

عاصی صحرائی

کرنل نیڈو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک افسر تھا جو برصغیر آیا تو ایک گجر لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ گجروں نے اسے اس شرط پر لڑکی دینے کی حامی بھری کہ وہ گجروں کی طرح زندگی گزار کر دکھائے۔ نیڈو نے کھدر پہنا جانور چرائے دودھ دوہا اور بالآخر مسلمان ہو کر اپنی محبوبہ سے شادی کر لی۔ اس کی گجر بیوی رانی جی کہلاتی تھی۔ آدمی سمجھدار تھا۔ اس نے کشمیر میں جانوروں کی نسل کشی کرنی شروع کر دی اور آہستہ آہستہ انگریز رجمنٹس کو گوشت کی سپلائی کا ٹھیکیدار بن گیا۔ نائیڈو کی ایک ہی بیٹی تھی جو ماں کی طرف سے مکمل گجر تھی اور باپ کی وجہ سے انگریزی زبان سے مکمل آشنا۔ نیڈو چونکہ مذہبی لوگوں سے بہت میل جول رکھتا تھا اور پیروں کا بہت خدمتگار تھا لہذا بیٹی بھی اسی رنگ میں رنگ گئی۔ کرنل لارنس عربی زبان کا ماہر تھا۔ اسکی قرآت بہت اعلی اور معلومات انتہائی جامع تھیں۔ برٹش سیکریٹ سروس نے لارنس کو لاہور میں لانچ کر دیا۔ جلد ہی مکہ کے بزرگ کی شہرت پھیل گئی۔ لوگ بہت بڑی تعداد میں آنے لگے اور کرنل لارنس انہیں اپنے ھب یعنی جہاد بالسیف سے برگشتہ کرنے لگا۔ نیڈو اپنے کام کے سلسلے میں لاہور آیا تو اسے بھی ملنے کا اشتیاق ہوا۔ خدمت میں حاضر ہوا تو جاٹوں والے لباس میں تھا۔ مکی شیخ سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اپنی لڑکی انکے عقد میں دینے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ اور یوں یہ لڑکی کرنل لارنس المعروف شیخ مکی کی بیگم بن گئی۔ کرنل لارنس کے پاس انگریز معتقدین بھی آتے تھے اور ان میں ایجنسی کے لوگ بھی تھے جن سے شیخ مکی اکیلے ملاقات فرماتے تھے۔ شادی کے چند دن بعد ایسی ہی ملاقات میں شیخ مکی نے نئی زوجہ کو مہمان داری کے لیے کہا۔ نئی بیگم جب مشروب و ماکولات لیکر کمرے میں گئی تو انگریزی میں ہونے والی تمام گفتگو سے آگاہ ہو گئی۔ شیخ مکی کے سازشی پلان کے بارے سمجھ گئی۔ اس نے خفیہ طریقے سے بذریعہ خط باپ کو آگاہ کیا۔ باپ فوراً لاہور پہنچا۔ بیٹی سے ملا اور پھر کرنل لارنس سے ملکر اپنا سابقہ تعارف کرا کر بیٹی کو طلاق دینے اور باپ کے ساتھ بھیجنے کا مطالبہ کیا۔ کرنل لارنس نے نیڈو کو خاموش رہنے اور برٹش ایمپائر کی خدمت کرنے کا کہا۔ نیڈو یہاں سے مایوس ہو کر رستم زماں بھولو پہلوان کیوالد کے پاس پہنچا اور تمام رام کہانی بتا دی۔ امام بخش پہلوان سچا عاشق رسول تھا۔

اپنے شاگردوں کے ساتھ شیخ مکی کے پاس جا پہنچا۔ شیخ مکی نے اسے درخورِ اعتنا نہ جانتے ہوئے دھمکیاں دیں اور دفع ہونے کو کہا۔ پہلوان نے شیخ کو اٹھایا اور دا تا دربار کے سامنے برگد کے درخت سے الٹا لٹکا دیا کہ جب تک لڑکی کو نہیں چھوڑو گے اور توبہ کر کے واپس نہیں جاؤ گے یونہی لٹکے رہو گے۔ چوبیس گھنٹے بعد کرنل لارنس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ لڑکی کو طلاق دلوا کر نیڈو کے ساتھ بھیج دیا گیا اور لارنس کو انگریز ریزیڈنٹ کے حوالے کر دیا گیا انہوں نے اُسے فوری برطانیہ بھیج دیا گیا۔ کرنل نیڈو کی لڑکی واپس کشمیر پہنچی تو کچھ عرصے بعد اسکی شادی شیخ عبداللہ سے کر دی گئی۔ یوں یہ لڑکی بیگم اکبر جہاں عبداللہ کہلائیں۔ جنکا بیٹا فاروق عبداللہ بعد میں کشمیر کا وزیر اعلیٰ بنا۔ نائیڈو کے خاندان نے لاہور اور کشمیر میں شاندار ہوٹلز کے بزنس میں خوب نام کمایا۔ شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ لاہور کے موجودہ آواری ہوٹل کی جگہ پہلے نائیڈو ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ مغربی طاقتوں کا یہ پُرانا اور بے رحمانا کھیل ہے۔ ترقی پذیر اور غریب مما لک میں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے، وقت اور ضرورت کے مطابق کردار تخلیق اور لائحہ عمل بدلتے رہتے ہیں۔

***

افسانہ

بھیگی پلکیں

سجاد انعام سہارن۔ لاہور (پاکستان)

آج نیامت بابا مسلسل روئے جا رہا تھا اور اس کے پاس اس کا اپنا کوئی بھی نہیں تھا جو اسے چپ کرائے یا تسلی دے۔ اسے اپنی بیوی اور بیٹے شدت سے یاد آ رہے تھے۔ پڑوس میں سے بھی آج اس کے پاس کوئی نہیں آیا۔ موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا یہ اس موسم کی پہلی بارش تھی ایسے میں سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں میں محصور ہو کر رہ گئے۔ نیامت بابا گھر میں اکیلا بیٹھا گزرے خوشگوار دنوں کو یاد کرتے ہوئے مسلسل روئے جا رہا تھا کبھی اپنی مرحومہ بیوی کو یاد کر کے اور کبھی اپنے دونوں بیٹوں کو یاد کر کے اور دل میں کہہ رہا تھا کہ کاش میرے بھی اپنے میرے پاس ہوتے مگر میں آج بالکل اکیلا ہوں میرا کوئی میرے پاس نہیں۔ یہی سوچتے ہوئے ماضی کے دریچے کھلنے لگے اور وہ ان خوبصورت لمحات میں کہیں کھو گیا۔ نیامت بابا کی شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی، لڑکی اس کے ماموں کی بیٹی تھی۔

والدین نے بیٹے کی شادی پر اپنے سارے ارمان پورے کئے کیونکہ نیامت والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دلہن کرامت بی بی بیاہ کر پیا دیس سدھار گئی۔ نیامت بابا کی پرچون کی دکان تھی اور گزر بسر بھی اچھی ہو رہی تھی۔ شادی کے دو سال بعد ان کے ہاں بیٹے نے جنم لیا۔ میاں بیوی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ دادا دادی نے پوتے کی پیدائش کی خوشی میں پورے محلے میں مٹھائی بانٹی۔ وقت پر لگا کر گزرتا رہا اور شادی کے پانچ سال بعد نیامت اور کرامت بی بی کے ہاں دوسرے بیٹے کا جنم ہوا۔ دوسرے بیٹے کی پیدائش پر میاں بیوی نے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر ادا کیا۔ اب گھر کے اخراجات میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے اس قلیل آمدنی میں گزارہ مشکل ہو رہا تھا لہٰذا نیامت نے اپنے ایک دوست سے قرض لے کر اپنی دکان میں مزید سامان ڈال دیا تا کہ آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ نیامت کے والد صاحب کی طبیعت ناساز رہنے لگی اور کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد انتقال کر گئے۔ نیامت بابا کی والدہ صاحبہ دمہ کی مریضہ تھیں آخر وہ بھی اس بیماری کے باعث انتقال کر گئیں۔ یکے بعد دیگرے والدین کی وفات سے نیامت غمگین رہنے لگا مگر اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ زندگی معمول پر آنے لگی۔ نیامت نے دونوں بیٹوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی وہ چاہتا تھا کہ میرے بیٹے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا بڑے بیٹے نے میٹرک کا امتحان اعزازی نمبروں سے پاس کرلیا اور دو سال بعد چھوٹے بیٹے نے بھی میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ نیامت بابا کے ذہن میں ایک ہی دھن سوار تھی کہ میں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اچھی تعلیم دلوانی ہے۔ کرامت بی بی نے بھی اپنے شوہر کا ساتھ دیتے ہوئے محلے کی عورتوں کے کپڑے سینے شروع کر دیئے تا کہ دونوں بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے ہوسکیں اور پڑھائی کا سلسلہ بلاتعطل جاری رہے۔

اب دونوں بھائی بڑی کلاسوں میں پہنچ چکے تھے اور تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے لئے نیامت کو ایک بار پھر اپنے دوست سے رقم قرض لینا پڑی۔ میاں بیوی سہانے خواب دیکھنے لگے اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ہمارے بیٹوں کی تعلیم جلد مکمل ہونے والی ہے جب یہ کمانے لگ جائیں گے تو ہم باقی زندگی سکون سے گزاریں گے۔ ماں کی خواہش تھی کہ میں جلد اپنے بیٹوں کی شادیاں کر کے اپنی بہوویں لے آؤں گی۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب بڑے بیٹے نے اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ ابھی کچھ ہی دن گزرے ہوں گے بڑے بیٹے نے ضد پکڑ لی کہ میں بسلسلہ روزگار بیرون ملک جانا چاہتا ہوں۔ آخر والدین کو اپنے بیٹے کی ضد کے آگے ہار ماننا پڑی اور وہ بیرونِ ملک روانہ ہوگیا۔ چھوٹے بیٹے نے بھی اپنی تعلیم مکمل کر لی اور مناسب روزگار کی تلاش میں نکل پڑا۔ کافی بھاگ دوڑ کے باوجود بیٹا مناسب روزگار حاصل کرنے میں ناکام رہا اور مایوس ہوکر اپنے ماں باپ سے بسلسلہ روزگار بیرون ملک جانے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ والدین کسی صورت بھی بیٹے کو دوسرے ملک بھیجنے کے حق میں نہ تھے۔ نیامت بابا اور کرامت بی بی نے اپنے بیٹے کو بہت سمجھایا کہ دیکھو بیٹا تمھارا بڑا بھائی پہلے ہی باہر کے ملک جا چکا ہے اگر تم بھی چلے جاؤ گے تو تمھارے بوڑھے والدین کا خیال کون رکھے گا۔ چھوٹے بیٹے نے یہ کہہ کر اپنے والدین کو منا لیا کہ جونہی مجھے اچھا روزگار ملا میں فوراً آپ کو اپنے پاس بلا لوں گا۔ کچھ دنوں کے بعد چھوٹا بیٹا بھی بیرونِ ملک روانہ ہوگیا۔ دونوں بیٹوں کے جانے کے بعد میاں بیوی تنہا رہ گئے۔ پہلے پہل دونوں بیٹوں کے خطوط تواتر کے ساتھ آتے رہے اور گھریلو اخراجات کے لیئے خاطر خواہ رقم بھی بھیجتے رہے مگر ماں باپ کا ہر بار یہی تقاضا ہوتا کہ ہمیں کب اپنے پاس بلاؤ گے اگر ایسا ممکن نہیں تو دونوں بھائی جلد واپس لوٹ آؤ۔ تم دونوں بھائیوں کے بغیر ہمارا دل نہیں لگتا۔ بیٹوں کا ہر بار یہی جواب ہوتا کہ چھٹی نہیں مل رہی ابھی اچھا روزگار نہیں ملا وغیرہ وغیرہ۔

آہستہ آہستہ خطوط آنے کا سلسلہ کم ہوتے ہوتے بالکل موقوف ہوگیا جس کی وجہ سے میاں بیوی بہت پریشان رہنے لگے اور ایک دن ان کے کسی جاننے والے کے توسط سے پتا چلا کہ دونوں بھائیوں نے پردیس میں ہی شادیاں کر لی ہیں اور وہاں عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس دل خراش خبر ملنے کے بعد نیامت بابا اور کرامت بی بی آہوں اس سسکیوں سے رونے لگے اور ساتھ یہی کہتے جاتے کہ ہم نے تو اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لیئے دن رات ایک کر دیئے اور اس ناخلف اولاد نے ہمیں یہ صلہ دیا۔ ہم نے تو اپنے بچوں کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم سے بھی روشناس کرایا۔ کرامت بی بی اپنے بیٹوں کی اس بے اعتنائی کا زیادہ ہی اثر لے لیا اور اس دکھ کی وجہ سے چارپائی سے جا لگی۔ نیامت بابا نے اپنی بیوی کا کافی علاج کرایا مگر طبیعت سنبھلنے کی بجائے زیادہ بگڑتی گئی۔ ایک رات طبیعت زیادہ بگڑنے کے باعث کرامت بی بی اس دارفانی سے رخصت ہوگئی۔ نیامت بابا اب بالکل تنہا رہ گیا۔ بیٹے پہلے ہی والدین کا ساتھ چھوڑ کر پردیس کے ہوکر رہ گئے اور اب کرامت بی بی بھی اس دار فانی سے رخصت ہوگئی۔ نیامت بابا کے پڑوسی بہت اچھے تھے ہر مشکل گھڑی میں نیامت بابا کا ساتھ دیا۔ پڑوسی دو وقت کا کھانا بھی دے دیتے اور بوقت ضرورت دوا بھی لا کر دے دیتے۔ سارا دن کا اکیلا پن اور راتوں کی تنہائی اسے کسی پل چین نہ لینے دیتی وہ دن رات بیٹوں کی بے اعتنائی اور بیوی کو یاد کر کے روتا رہتا۔ نیامت بابا کو دکھ یہ بھی تھا کہ اسکے بیٹوں نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں کہ انکے بوڑھے والدین کس حال میں ہیں۔ دن رات کے رونے کی وجہ سے نیامت بابا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی رہتیں۔ سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا اور ٹھٹھرتی راتوں میں نیامت بابا اکیلا ہی سوتا اور جب کبھی طبیعت زیادہ ناساز ہوتی تو پڑوس میں سے کوئی آ کر نیامت بابا کے پاس سو جاتا۔ سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا اور کچھ دنوں سے نیامت بابا کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا اور ساتھ کھانسی بھی شروع ہوگئی۔ پڑوسی نے دوائی دوا بھی لا کر دی تا کہ طبیعت سنبھل جائے۔ اگلی رات طبیعت زیادہ بگڑ گئی بخار بھی تیز ہوگیا اور کھانسی بھی بڑھتی گئی۔ اس قدر بیماری کے باوجود بھی نیامت بابا اپنے دونوں بیٹوں کے نام لے لے کر پکارتا رہا اور ہچکیوں سے روتے ہوئے بے اختیار آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ دوا دینے کے باوجود بھی نہ بخار کم ہوا نہ ہی کھانسی کم ہوئی۔ طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور آخر نیامت بابا غیروں کے ہاتھوں میں آنسوؤں سے بھیگی پلکوں کے ساتھ اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

گلزار بحیثیت افسانہ نگار

ڈاکٹر محمد زاہد کلکتہ۔انڈیا

گلزار کا اصل نام سمپورن سنگھ کالرا ہے۔ان کی پیدائش پنجاب کے ایک گاؤں دینہ (موجودہ پاکستان) میں ۱۸/اگست ۱۹۳۶ء کو ہوئی۔والد کا نام ماکھن سنگھ کالرا اور والدہ کا سوجان کور تھا۔والدہ کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہوگیا۔ ۱۹۴۷ء میں گلزار کا خاندان ہجرت کر کے پہلے امرتسر اور پھر دہلی پہونچا۔انھوں نے دہلی یونائیٹیڈ کرسچن اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا لیکن کالج کی پڑھائی پوری نہ کر سکے۔روزگار کے سلسلے میں بمبئی پہنچے جہاں ان کے بھائی جسیمر سنگھ رہتے تھے۔کاروباری زندگی انہیں راس نہیں آئی اور چند ماہ بعد اپنے بھائی کا گھر چھوڑ کر انھوں نے مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کے یہاں پناہ لی۔کچھ دنوں تک آٹو موبائل ورک شاپ میں کام کیا اور ساتھ ہی اپٹا (Indian People's Theatre Association) سے منسلک ہو گئے۔یہیں ان کی ملاقات باسو بھٹاچاریہ، سلیل چودھری، شیلندر، دیبو سین وغیرہ جیسی فلمی ہستیوں سے ہوئی جس نے ان کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ ۱۹۶۱ء میں ہدایت کار بمل رائے فلم ''بندنی'' بنا رہے تھے۔دیبو سین ان کے اسسٹینٹ تھے۔گلزار کو بمل رائے سے انہوں نے ہی متعارف کرایا۔اس فلم میں گلزار کا لکھا ایک گانا بہت مشہور ہوا ''میرا گورا رنگ لے لے۔موہے شیام رنگ دئی دے ...'' اس گیت کے ذریعہ وہ فلمی دنیا کے قریب آ کے اور بمل رائے کے گروپ میں شامل ہو گئے۔نغمہ نگاری کے ساتھ اسی زمانے میں انہوں نے کہانیاں بھی لکھنی شروع کیں۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''چورس رات'' ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔''راوی پار'' ان کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔''دھواں'' ان کا سب سے مشہور مجموعہ ہے۔اس میں کل ۲۷ کہانیاں ہیں جس پر انھیں ساہتیہ اکاڈمی کا انعام ملا ۲۰۰۴ء میں انھیں حکومت ہند نے ''پدم بھوشن'' سے نوازا ''ڈیوڑھی'' ۲۵ کہانیوں پر مشتمل چوتھا مجموعہ ہے۔

گلزار کا تعلق اس نسل سے ہے جو ادبی دنیا میں ۱۹۶۰ء کے بعد منظر عام پر آئی۔ان سے پہلے منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، ساغر نظامی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی وغیرہ اپنے قلم کی جولانیاں دکھا چکے تھے۔ترقی پسند تحریک کے قلم کار آخری دور میں تھے جدیدیت کے نام سے ایک نئی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔کچھ قلم کار اساطیری اور دیومالائی روایتوں سے اپنا رشتہ جوڑ رہے تھے۔کچھ وجودیت کو اپنی تحریروں کا مرکز بنا رہے تھے۔احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، انتظار حسین، جوگندر پال، ممتاز مفتی، شوکت صدیقی، ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر وغیرہ فکر و فن کے نئے چراغ روشن کر رہے تھے۔گلزار نے اگرچہ ساری روایتوں سے استفادہ کیا لیکن کسی خاص تحریک کے زیر اثر نہیں آئے۔انہوں نے اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی۔وہ راہ جو سیدھی اور ہموار ہے اور براہ راست قارئین کے دلوں تک پہونچتی ہے۔گلزار کی کہانیوں میں موضوع کہیں گم نہیں ہوتا۔کہانی کہنے کے انداز میں حقیقت پسندی اور ایمانداری پائی جاتی ہے۔اسلوب رواں دواں ہے۔لہجے میں نرمی اور حلاوت ہے جو کڑوی سچائی کو نگلنے میں مدد کرتا ہے۔ان کے کردار اسی دنیا کے باشندے ہیں۔ان میں خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔

وہ ہنستے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں۔گلزار نے فلمی دنیا کی چکا چوند کر دینے والی دنیا سے لے کر فٹ پاتھ کے کنارے بسیرا کرنے والے افراد تک کی عکاسی کی ہے۔''گڈی'' گلزار کی ایک خوبصورت کہانی ہے جس میں انہوں نے بچپن سے نوجوانی کا سفر طے کرتی ایک معصوم اور حساس لڑکی کے احساسات کو پیش کیا ہے۔وہ دلیپ کمار کی پرستار ہے۔گڈی کو فلم کی شوٹنگ دیکھنے کا موقعہ اتفاق سے مل جاتا ہے۔خواب جب حقیقت سے ٹکراتے ہیں تو کیا ہوتا ہے یہ افسانہ نگار کی زبانی سنئے ''جب شوٹنگ پر پہونچے تو دلیپ اور وجینتی (مالا) ایک سین کی ریہرسل کر رہے تھے۔سہمی سہمی سی وہ ایک طرف کھڑی رہی۔دلیپ وجینتی کا ہاتھ پکڑے کہہ رہا تھا 'لتا اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتی۔میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہیں پا لیا ہے۔بتاؤ میرے ساتھ چلو گی لتا''۔اور لتا نے پیار سے اپنا سر دلیپ کے سینے پر رکھ دیا۔

'بے شرم' کسم من ہی من بڑبڑاتی رہی۔شاٹ ختم ہوا تو ماموں نے کہا ''گڈو جاؤ لے لو آٹو گراف''۔''نہیں مجھے نہیں لینا ہے آٹو گراف!'' وہ بھرّا کر بولی۔اس کے بعد گھر واپس جا کر کسم عرف گڈی نے اپنی ڈائری سے دلیپ کمار کی تصویر نکال کر کھڑکی سے باہر پھینک دی۔فلمی دنیا سے الگ ہٹ کر گلزار آس پاس نظر ڈالتے ہیں تو انہیں جھگی جھونپڑیوں والے اور ان سے بھی نچلے درجہ کے افراد دکھائی پڑتے ہیں جن کا طرز معاشرت ہی کچھ اور ہے۔ان کی خوشیاں

اور غم الگ ہی انداز کے ہیں۔ اس طبقہ کی ترجمانی ''فٹ پاتھ سے'' میں وہ یوں کرتے ہیں۔

''پتہ نہیں کیسے ایک دن' ایک گاڑی نے شینڈی (کتے) کو اڑا دیا۔ بڑی تکلیف ہوئی دونوں کو۔ ہیرا بھی روئی۔ اس دن بولی' جب بھیکو مرا تھا گاڑی سے ٹکرا کے' ایسا ہوا تھا۔ دگڑو نے پوچھا ''کیا ہوا تھا؟'' رات کو اٹھا تھا پیشاب کرنے کے لیے۔ سڑک کے پار جا رہا تھا۔ ریلوے لائن کی طرف۔ اُدھر سے ایک کار آئی۔ بہت تیز.....اور اُڑا دیا۔ گرا جب اوپر سے نکل گئی۔ روکا بھی نہیں سالے نے! صبح میونسپلٹی کی گاڑی آئی۔ اِدھر اُدھر پوچھا۔ میں بولی نہیں۔ کیا کرتی؟ کون جاتا پولیس میں؟ اور پھر لاش لے کر جلاتا کون؟ میونسپلٹی کی گاڑی لے گئی۔ ایسے ہی' جیسے شینڈی کو گھسیٹ کے لے گئی؟ فٹ پاتھ کی زندگی سالی ایسی اِچ ہے!'' یہ وہ لوگ ہیں جن کی پیدائش اور موت دونوں اتفاقیہ ہوتی ہے۔ ان میں اور کتے بلیوں کی زندگی میں بڑی یکسانیت ہے۔ ہندستان کے بڑے شہروں میں یہ طبقہ موجود ہے اور اپنے طور سے زندگی گذار رہا ہے۔

۱۹۴۷ء میں ہندستان کی تقسیم نے لکھنے والوں کو ایک نیا موضوع دیا۔ خاک وخون سے شرابور اس آزادی نے لاکھوں لوگوں کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ گلزار نے خود اس عذاب کو سہا۔ اپنی آنکھوں سے قتل اور لوٹ مار کے مناظر دیکھے۔ ''راوی پار'' ان کی ایسی کہانی ہے جس میں ہجرت کا کرب جھیلتے عوام کے درد کی عکاسی کی گئی ہے۔ کہانی کا آغاز یوں ہوتا ہے'' پتہ نہیں درشن سنگھ کیوں پاگل نہیں ہوگیا؟ باپ گھر پر مر گیا اور ماں اس بچے کھچے گرودوارے میں کھو گئی.....اور شا ہنی نے ایک ساتھ دو بچے جنم دیئے۔ دو بیٹے، جڑواں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ہنسے یا روئے۔ اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے کا سودا کیا تھا قسمت نے۔'' درشن سنگھ گرودوارے میں پناہ لیے ہوئے تھا۔ فساد کی خبریں سن کر پریشان ہو اُٹھا۔ اُسے امید تھی کہ شر پسند یہاں حملہ نہیں کریں گے۔ مگر دوسروں کی دیکھا دیکھی اس نے بھی ہندستان جانے کی ٹھان لی۔ اپنی بیوی اور دو کمزور بچوں کے ساتھ وہ ٹرین پر سوار ہو جاتا ہے مگر ایک بچہ راستہ میں فوت ہو جاتا ہے۔ اس المناک داستان کو افسانہ نگار یوں بیان کرتا ہے۔ ''اِس شور میں کسی نے درشن سنگھ کے کان میں پھسپھسا کر کہا۔ ''سردار جی۔ بچے کو یہیں پھینک دو راوی میں۔ اس کا کلیان ہو جائے گا۔ اُس پار لے جا کر کیا کرو گے؟ درشن سنگھ نے دھیرے سے ٹوکری دور کھسکالی اور پھر یک لخت ہی پوٹلی اٹھالی اور واہے گرو کہہ کر راوی میں پھینک دی۔ اندھیرے میں ہلکی سی آواز سنائی دی۔ کسی بچے کی۔ درشن سنگھ نے گھبرا کے دیکھا شا ہنی کی طرف۔ مردہ بچہ شا ہنی کی چھاتی سے لپٹا ہوا تھا۔'' درشن سنگھ نے اپنے زندہ بچے کو غلطی سے راوی ندی میں پھینک دیا تھا۔ تقسیمِ ہند میں ایسے کتنے لوگ اپنوں سے جدا ہو گئے۔ کتنے مر کھپ گئے۔ کتنے خانماں برباد ہو گئے۔ ''دھواں'' ایک گاؤں کے سیدھے سادے مسلمان چودھری کی داستان ہے جو انسان دوستی کے سبب یہ وصیت کرتا ہے کہ اس کی لاش کو جلا کر اس کی راکھ اس کے کھیتوں پر بکھیر دی جائے۔ اس کی بیوی اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہے تو گاؤں کے مولوی اور پروہت اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ یہاں مذہبی رہنما مذہب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اس نشہ سے اپنی انا کو تسکین پہونچاتے ہیں۔ چودھری کی بیوی کا انجام یہ ہوتا ہے''۔ رات چودھری کی خواب گاہ سے آسمان چھوتی لپٹیں نکل رہی تھیں تو قصبہ دھویں سے بھرا تھا۔ زندے جلا دیئے گئے تھے اور مردے دفن ہو چکے تھے۔'' گلزار اپنے موضوعات کا انتخاب فیشن کے طور پر نہیں کرتے۔ وہ زندگی کی ترجمان کرتے ہیں۔ وہ انسانوں کے مسائل کو ہمدردی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ انسان سائنس کی ترقی کا ڈھول بجا کر چاند ستاروں کو تسخیر کرنے کی باتیں کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ آج بھی طاقت کا پجاری ہے۔ وہ ظلم کرتا بھی ہے اور اپنے بھائیوں کو ظلم سہنے پر مجبور بھی کرتا ہے۔ آج بھی لوگ ذات پات میں بٹے ہوئے ہیں۔ آج بھی بہت سے لوگ دوسرے کے کنویں سے پانی نکال کر نہیں پی سکتے۔ ان کے برابر نہیں بیٹھ سکتے۔ ان کی عبادت گاہوں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ گلزار کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ ان کی معلومات وسیع ہیں۔ انہیں اپنے کرداروں سے خاصہ لگاؤ ہے۔ ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ ان کے یہاں لفاظی اور آرائش بیان نہیں ہے۔ وہ خود کو جینیس (Genious) کہلانے کے زعم میں افسانوں میں ٹھونس ٹھانس نہیں کرتے اور نہ اپنے قاری کی ذہانت کا امتحان لیتے ہیں۔ جس طرح وہ خود مٹی سے جڑے ہیں اسی طرح ان کے کردار بھی عام انسانوں کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ ان کی دیگر مشہور کہانیوں میں جنگل نامہ' ہاتھ پیلے کر دو' آگ' اڈھا' مائیکل اینجلو' خوف' سانجھ' مرد' کاغذ کی ٹوپی وغیرہ ہیں۔

***

آسمان صحافت کا ستارہ

عارف نقوی

پنڈت کرشن کمار شرما ملک کے سب سے مقبول صحافی ہیں۔ بڑے بڑے ادارے انہیں اعزاز بخش چکے ہیں۔ عام زبان پر انہیں آسمانِ ادب کا ستارہ کہا جاتا ہے۔ ہرا بھرتا ہوا صحافی ان کی نقل کرنا چاہتا ہے۔ وہ نہایت پڑھے لکھے، انسانیت پرست، بے باک، نڈر، دانشمند، دوراندیش اور باریک بین ہیں۔ ان کی تحریروں میں تاریخی چھان بین ہوتی ہے۔ موجودہ حالات کا حقیقی اور تفصیلی جائزہ لیتے اور واقعات کی جڑوں کو کرید کر اپنے کالموں میں اصلیت اور وجوہات کا بیان کرتے ہیں اور بہترین عالمانہ پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ ان کی رپورٹوں اور کالموں میں سماج کے ہر طبقے کی بدحالی کسمپرسی اور وجوہات کی بچی تصویر میں ہوتی ہیں۔ ان کی رپورٹوں نے کئی بار ملک کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے بچایا ہے۔ ان کا اخبار ڈیلی ہیومن افیرس بھی ان پر ناز کرتا ہے۔ اور اگر وہ بھی کسی دوسرے اخبار میں کالم لکھ دیتے ہیں تو اسے ٹوکنے کی مجال نہیں ہوتی ہے۔ اس بار بھی پنڈت کرشن کمار شرما کئی ہفتوں سے ایک بڑی اسلحہ سازی کی فرم کے خلاف چھان بین کر رہے تھے جس نے ایک بڑی خوبصورت جھیل کے کنارے اپنا کیمیکل کارخانہ قائم کیا تھا اور اس کا سارا گندہ زہریلا مواد اور پانی جھیل کے پانی کو خراب کر رہا تھا۔ دور دور کے علاقوں کے لوگوں کی صحت پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ پنڈت کرشن کمار شرما نے اس علاقے کا باقاعدہ سروے کیا جھیل کا پانی ایک لیبارٹری میں لے جا کر معائنہ کروایا۔ وہاں کام کرنے والوں کی زندگی اور صحت کا جائزہ لیا۔ ان سے انٹرویو لئے۔ یہاں تک کہ کارخانے کے بعض افسروں اور مقامی ضلع پریشد کے ادھیکاریوں سے انٹرویو لے لئے۔ قریبی اسپتال میں جا کر وہاں کے ڈاکٹروں سے سوالات کر لئے۔ اس کمپنی کو کونسی فرمیں کیمیکل کی سپلائی کر رہی ہیں اور کس محکمے اور افسروں نے اجازت دی ہے یہ بھی پتا لگا لیا۔ غرضیکہ ایسی ایسی باتیں جنہیں سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پنڈت کرشن کمار شرما کی رپورٹ پڑھکر اخبار کا چیف ایڈیٹر خوشی سے اچھل پڑا۔ س نے جوش میں سارے عملے کو جمع کر لیا اور ان کی تعریف کرتے ہوئے انہیں خود بھی آسمان صحافت کا ستارہ کہتے ہوئے گلے سے لگا لیا اور اعلان کیا: 'کل ڈیلی ہیومن افیرس کے پہلے صفحے کی سب سے اہم رپورٹ پنڈت کرشن شرما کی بی اسٹوری ہوگی۔ اس دن اخبار کے بھی مدیروں اور دیگر ملازمین نے پنڈت کرشن شرما کو مبارکباد میں دیں۔ رات کو ان کی پتنی نے بھی عجب دل آویز ادا سے ان کا استقبال کیا۔ رات بھر پنڈت کرشن شرما کیمیکل کارخانے اور جھیل کے خواب دیکھتے رہے۔ صبح ان کی آنکھ کھلی۔ انہوں نے انگڑائی لی اور ہاتھ منہ دھو کر گھر کا دروازہ کھولا۔ ڈیوڑھی میں ڈیلی ہیومن افیرس کے تازہ شمارے کا بنڈل پڑا تھا۔ پہلے صفحے پر خاص سرخی اقوام متحدہ کے اجلاس کی تھی۔ اس کے نیچے کی سرخی فغانستان میں ہوئے زلزلے کی تھی اور لرزہ خیز تصویر میں تھیں۔ ایک دوسری خبر ایک اندوہناک بس حادثے کی تھی اور ایک خبر ناروے میں ایک دہشتناک حملے کے بارے میں تھی۔ دوسرے، تیسرے اور چوتھے صفحے پر بھی ان کی رپورٹ نہیں تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی اپنے پلٹے اور آخری صفحے پر نظر ڈالی، کیونکہ کسی بھی اخبار میں یہ صفحہ خبروں کے لئے اہم ہوتا ہے۔ لیکن وہاں بھی ان کی رپورٹ نہیں تھی۔ بلکہ جس کیمیکل کارخانے کا انہوں نے ذکر کیا تھا اس کا بڑا سا رنگین تصویر کے ساتھ اشتہار تھا جس کے پس منظر میں ہرے ہرے پیڑوں سے گھری جھیل کا دلکش منظر تھا۔ پنڈت کرشن شرما نے اپنا سر پیٹ لیا۔ انہیں ایسا لگا جیسے کوئی ستارہ آسمان سے ٹوٹ کر اسی جھیل میں غرق ہو گیا ہے۔

عارف ثاقب

یہ وجود عالم رنگ و بو، یہ مثال ہے یا خیال ہے
میری آگہی کے نصیب میں یہی اک سلگتا سوال ہے
جو کبھی نہ خود سے نکل سکوں، تو تمھاری جانب نظر کروں
میں اسیر اپنے جنوں کا ہوں، مجھے کب تمہارا خیال ہے
یہی اک مال ہے زیست کا کہ خوشی یہاں ہے گریز پا
غم مستقل مجھے کر عطا، یہ میری بقا کا سوال ہے
وہ جو ایک شخص نہ مل سکا، تو یہ دل کا غنچہ نہ کھل سکا
میری داستان بھی عجیب ہے، کہ نہ ہجر ہے نہ وصال ہے
میں کسی کے پاس نہ جا سکا، کوئی میرے پاس نہ آ سکا
یہ میری جو صورت حال ہے، یہ تیری نظر کا کمال ہے
کہ کہاں پہ آ کے ٹھہر گیا، میرے جذب شوق کا مرحلہ
نہ عروج ہے میری تلاش میں نہ ہی جستجو میں زوال ہے
میری آرزو ہی ہیں نارسا، وہ میرے خیال سے ماورا
اسے دیکھنے کی تو بات کیا، جسے سوچنا بھی محال ہے

پاکستان واپس آنے والی بدقسمت لڑکیاں

یاسر پیرزادہ

پہلا واقعہ دو ماہ پہلے کا ہے۔ چوبیس برس کی انیسہ اور بیس سال کی عروج، اپنی والدہ کے ساتھ اسپین سے گجرات پہنچیں، یہ دونوں لڑکیاں محمد عباس نامی شخص کی بیٹیاں تھیں جو کچھ دہائیوں قبل روزگار کے سلسلے میں اسپین منتقل ہوا تھا۔ عباس نے اِن لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح اپنے بھائی کے بیٹے اور دوسری کا اپنی بہن کے بیٹے سے کیا ہوا تھا۔ لڑکے والوں کا پلان یہ تھا کہ نکاح کے کاغذات کی بنیاد پر اِنہیں اسپین بلالیا جائے گا تاہم لڑکیاں اِس سارے بندوبست سے مطمئن نہیں تھیں تاہم لڑکیوں کو دھوکے سے یہ کہہ کر اسپین سے گجرات بلایا گیا کہ اگر انہیں اپنے شوہر پسند نہ آئے تو پھر وہ فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گی۔

جب یہ دونوں لڑکیاں اپنی والدہ عذرا بی بی کے ساتھ گجرات پہنچیں تو انہوں نے صاف الفاظ میں بتادیا کہ وہ اپنے کزنز کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتیں، اُن کا چچا اپنی بھتیجیوں کی یہ 'بدتمیزی' برداشت نہ کرسکا اور ہتھے سے اکھڑ گیا اور اُس سگیچا نے بھائیوں اور لڑکیوں کے شوہروں کے ساتھ مل کر اُن بچیوں کو درندوں کی طرح قتل کرڈالا۔ ''میں نے بچیوں کی چیخیں سنیں جو کہ آہستہ آہستہ ختم ہوگئیں، بعد میں گولیاں چلنے کی آواز آئی، مگر شاید وہ گولیاں لگنے سے پہلے ہی مرچکی تھیں۔'' یہ بیان عذرا بی بی نے پولیس کو دیا۔ ''بیٹیاں ساتھ لائی تھی، اب خالی ہاتھ واپس جاؤں گی۔''

دوسرا واقعہ پچھلے ماہ کا ہے۔ ساجدہ تسنیم انجینئرنگ یونیورسٹی کراچی سے فارغ التحصیل تھی، سول انجینئر تھی، 2011 میں اُس کی شادی سرگودھا میں ایوب احمد نامی شخص کے ساتھ ہوئی، وہ بھی انجینئر تھا۔ شادی کے بعد ساجدہ کو پرتھ، آسٹریلیا میں ایک شاندار ملازمت مل گئی اور دونوں میاں بیوی 2013 میں اپنے بیٹے سمیت پرتھ منتقل ہوگئے جہاں اُن کی دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ساجدہ کا شوہر پرتھ میں اپنی ملازمت برقرار نہ رکھ سکا اور بحرین چلا گیا جبکہ ساجدہ اور بچوں کو آسٹریلوی شہریت مل گئی۔ ساجدہ کے شوہر نے اُس پر زور دینا شروع کیا کہ وہ پاکستان واپس چلی جائیکیونکہ اُس کے ماں باپ اپنے پوتے پوتیوں کو دیکھنا چاہتے ہیں، ساجدہ شوہر کی باتوں میں آکر پاکستان واپس آگئی، گھر پہنچتے ہی اُس کے سسر نے یہ کہہ کر اُس کا پاسپورٹ اپنے پاس رکھ لیا کہ کہیں یہ گُم نہ ہوجائے۔ ساتھ ہی ساجدہ کے سسرال والوں کا رویہ یکسر بدل گیا، انہوں نے کہنا شروع کردیا کہ اب آسٹریلیا کو بھول جاؤ، وہ غیر مسلم ملک ہے، بچے وہاں رہیں گے تو اپنی مذہبی شناخت کھو دیں گے۔ ''ہم پوتے پوتیوں کو کسی صورت کافروں کے ملک میں نہیں رکھ سکتے۔'' دھیرے دھیرے جھگڑا بڑھنے لگا، وہ لوگ ساجدہ سے مار پیٹ بھی کرنے لگے۔ ایک دن ساجدہ کا والد اپنی بیٹی کو ملنے اُس کے سسرال آیا تو اسے بالائی منزل سے شور سنائی دیا، وہ بھاگ کر اوپر پہنچا تو دیکھا کہ بیٹی کے سسر نے اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا ہے اور وہ اُس پر کلہاڑی سے وار کررہا ہے، دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے ساجدہ کے ٹکڑے کردیئے اور کلہاڑی لہراتا ہوا فرار ہوگیا۔ ویسے تو اِس دنیا میں آئے روز ہی ظلم کی ایک نئی داستان رقم ہوتی ہے، بندہ کس پر ماتم کرے اور کس پر آنکھیں بند کرکے لاتعلق ہوجائے لیکن نہ جانے کیوں جب میں نے یہ دونوں واقعات پڑھے تو لرز اٹھا، انسان اِس قدر سفاک بھی ہوسکتا ہے کہ اپنی سگی بھتیجی یا بہن کا گلا کاٹ ڈالے یا اپنے پوتے پوتیوں کی ماں کا سر کلہاڑی سے کچل دے۔ لیکن شاید میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں، دنیا میں اس سے بھی کہیں زیادہ جلاد صفت اور بے رحم انسان پائے جاتے ہیں۔ والدین اپنی اولاد کو قتل کردیتے ہیں تو باقی کسی سے انسانیت کیا امید رکھی جائے! اِن دونوں واقعات میں جو بات مشترک ہے وہ مغربی ممالک میں کی جانے والی ہجرت اور اس سے جڑے مسائل ہیں۔ ملک چھوڑ کر باہر بس جانے والے لوگوں میں سے بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو سمجھداری کے ساتھ اپنی زندگیوں کو ایک نئے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ ملک چھوڑنا کوئی آسان فیصلہ نہیں ہوتا، یہ ایک مکمل تبدیلی کا نام ہے، جب ہمیں کسی مغربی ملک کی شہریت ملتی ہے تو اُس وقت ادراک نہیں ہوتا کہ اِس کی کچھ قیمت ایسی بھی ہوگی جو اپنی شناخت اور روایات کی قربانی کی صورت میں ہمیں چکانی پڑے گی۔ انیسہ اور عروج کے باپ محمد عباس نے اسپین کی شہریت تو لے لی مگر ذہنی طور پر وہ گجرات کے قصبے گلیانہ کے گاؤں نوتھیہ میں ہی رہا، اُس کا ذہن یہ تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوا کہ بیٹیاں شادی سے انکار کے فیصلے کا اختیار رکھتی ہیں، وہ اپنے بھائی، بہن اور بیٹوں کے ساتھ مل کر اُن بچیوں پر دباؤ ڈالتا رہا اور یوں ایک طرح سے وہ اُن کے قتل کا شریک مجرم ہے۔ دوسری طرف ساجدہ کے شوہر نے بھی آسٹریلیا ہجرت کرنے کا فیصلہ تو کرلیا مگر ذہنی طور پر وہ بھی سرگودھا میں ہی رہا۔ اُس نے آسٹریلیا جانے کی خوشی میں یہ نہیں سوچا کہ کل کو اُس کے بچے بچیاں پیدا ہوں گے تو وہ آسٹریلوی شہری ہوں گے اور اُن کی تعلیم و تربیت بھی اسی انداز میں ہوگی۔ اگر یہ سب کچھ اسے قبول نہیں تھا تو اسے

آسٹریلیا جانے کا فیصلہ ہی نہیں کرنا چاہئے تھا اور اگر اُس کی بیوی آسٹریلیا ہجرت کرنے پر اصرار کرتی تو انہیں سمجھداری سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہئے تھی۔ مگر یہ تمام باتیں اِس وقت لکھنی آسان ہیں، غیب کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔

ساجدہ یا انیسہ یا عروج کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اُن کے مرد اُن کو دھوکے سے پاکستان بلا کر اُن کے گلے کاٹ دیں گے۔ اِن بے گناہ خواتین کے ساتھ جو ہوا اُس کا انصاف تو اب روزِ محشر ہی ہوگا، فی الحال وہ عورتیں جو باہر سیٹل ہیں، اُنکو یہ مشورہ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ کسی پاکستانی مرد سے محض اِس لئے شادی نہ کریں کہ وہ اُن کی مدد سے باہر سیٹل ہونا چاہتا ہے، یا اپنے رشتے داروں کے جھانسے میں پاکستان نہ آئیں کہ یہاں اُنکے اچھے رشتے مل جائیں گے۔ اگر آپ باہر رہتے ہیں تو پھر وہی طرزِ زندگی گزارنے کی کوشش کریں جو وہاں کا ہے When in Rome, as the do Romans do، اپنی زندگی ذہنی مریض مردوں کے سپرد نہ کریں ورنہ زندگی بھر کا پچھتاوا ہوگا جس کا کوئی مداوا نہیں ہوگا۔

یزیدِ وطن - شہزادہ مبشر گلاسگو

ایک عورت اور وکیل کی گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئیں، حادثہ اتنا زور دار تھا کہ دونوں کی گاڑیاں تقریبا تباہ ہو گئیں۔ لیکن حیرت انگیز طور پر دونوں بالکل بچ گئے۔ باہر نکل کر وکیل نے عورت سے کہا: یقین نہیں آتا کہ ہم دونوں کی گاڑیاں تباہ ہس وگئی ہیں اور ہم دونوں بالکل خیریت سے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے کہ شاید قدرت کو ہماری ملاقات مقصود تھی کہ ہم دونوں دوست بن جائیں... مجھے بھی ایسا لگتا شاید قدرت ہمیں ملانا چاہتی تھی، عورت نے جواب دیا۔ وکیل نے کہا کہ ایک اور معجزہ دیکھو کہ میری گاڑی تو تباہ ہوگئی ہس ے لیکن اس میں رکھی شیمپین کی بوتل بالکل محفوظ ہیں۔ چلو مل کر اس حادثاتی ملاقات کو انجوائے کرتے ہیں، وکیل نے بوتل عورت کے حوالے کرتے ہوئے کہا... عورت نے بوتل کھولی اور غٹا غٹ کر کے آدھی پی گئی اور پھر نشیلی آنکھوں سے وکیل کا جائزہ لیتے ہوئے بوتل واپس وکیل کے حوالے کر دی، وکیل نے بوتل کا ڈھکن بند کیا اور بوتل عورت کی گاڑی کی ڈگی میں رکھ دی، عورت نے حیرت سے پوچھا کیا آپ نہیں پیو گے؟ وکیل نے کندھے اُچکاتے ہوئے جواب دیا...!! میں پولیس کا انتظار کر رہا ہوں کہ آ کر دیکھے کہ نشے میں گاڑی کون چلا رہا تھا؟ زرداری نے مسلم لیگ ن کے ساتھ کچھ ایسے ہی کیا ہے۔

عقلمندی کا شاہکار دلچسپ عربی حکایت

رانا عبدالغفور صاحب

کہتے ہیں ایک بدو کسی شہری بابو کا مہمان ہوا۔ میزبان نے ایک مرغی ذبح کی۔ جب دسترخوان بچھ گیا تو سب آموجود ہوئے۔ میزبان کے گھر میں کل چھ (6) افراد موجود تھے دو میاں بیوی، دو ان کے بیٹے اور دو بیٹیاں۔ میزبان نے بدو کا مذاق اُڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ میزبان: آپ ہمارے مہمان ہیں۔ کھانا آپ ہی تقسیم کریں۔ بدو بولا مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں لیکن اگر آپ کا اصرار ہے تو کوئی بات نہیں۔ لائیے! میں ہی تقسیم کر دیتا ہوں۔

بدو نے یہ کہہ کر مرغی اپنے سامنے رکھی، اس کا سر کاٹا اور میزبان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''آپ گھر کے سربراہ ہیں لہذا مرغی کا سر، ایک سربراہ کو ہی زیب دیتا ہے''۔ اس کے بعد مرغی کا پچھلا حصہ کاٹا اور کہا ''یہ گھر کی بیگم کے لیے''۔ پھر مرغی کے دونوں بازو کاٹے اور کہا ''بیٹے اپنے باپ کے بازو ہوتے ہیں۔ اس لئے بازو بیٹوں کے لیے''۔ بدو نے بیٹیوں کی طرف دیکھا اور کہا ''بیٹیاں کسی بھی خاندان کے وقار کی بنیاد ہوتی ہیں اور سارے خاندان کی عزت ان کے وقار پر کھڑی ہوتی ہے''۔ یہ کہہ کر مرغی کے دونوں پاؤں کاٹے اور میزبان کی بیٹیوں کو دے دیے۔ پھر مسکرا کر کہنے لگا ''اب جو باقی بچ گیا ہے وہ مہمان کے لیے''۔ میزبان کا شرمندگی سے برا حال تھا۔ اگلے دن اس نے اپنی بیوی کو کہا کہ آج پانچ مرغیاں ذبح کرنی ہیں۔ بیوی نے ایسا ہی کیا اور جب دسترخوان لگا تو اس پر پانچ بھنی ہوئی مرغیاں موجود تھیں۔ میزبان نے سوچا کہ دیکھتے ہیں کہ آج یہ پانچ مرغیوں کو کس طرح تقسیم کرے گا؟ میزبان: ان مرغیوں کو سب افراد میں برابر تقسیم کر دو۔ بدو: جفت میں یا طاق میں؟ میزبان: طاق انداز میں ہی تقسیم کر دو۔ بدو نے میزبان کی بات سن کر سر ہلایا، تھال سے ایک مرغی اٹھائی، میاں بیوی کے سامنے رکھی اور بولا ''آپ اور آپ کی بیوی دو اور ایک یہ مرغی، کل ملا کے تین۔ پھر دوسری مرغی اٹھائی اور کہا'' آپ کے دونوں بیٹے اور ایک مرغی، کل ملا کے یہ بھی تین ہوئے''۔ اس کے بعد تیسری مرغی اٹھائی اور کہا'' آپ کی دو بیٹیاں اور ایک مرغی؛ کل ملا کر یہ بھی تین ہو گئے''۔ اب تھال میں دو مرغیاں باقی تھیں۔ اس نے وہ مرغیاں اپنے سامنے رکھیں اور کہنے لگا'' یہ دو مرغیاں

اور ایک میں؛ یہ بھی تین ہو گئے''۔ میزبان بدو کی یہ تقسیم دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے اگلے دن پھر پانچ مرغیاں روسٹ کیں۔ جب سب لوگ دسترخوان پر بیٹھ گئے تو میزبان نے بھنی ہوئی پانچوں مرغیاں بدو کے سامنے رکھیں اور بولا آج بھی تقسیم تم ہی کرو گے لیکن آج تقسیم کی نوعیت جفت میں ہونی چاہیے۔

بدو: لگتا ہے کہ تم لوگ میری پچھلی تقسیم سے ناراض ہو۔ میزبان: ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ تقسیم شروع کریں۔ بدو نے مرغیوں کی طشتری سامنے رکھی۔ اس میں سے ایک مرغی اٹھائی اور کہنے لگا ''ماں، اس کی دو بیٹیاں اور ایک مرغی؛ یہ ہوئے کل ملا کر چار''۔ یہ کہہ کر پہلی مرغی ان کی طرف بڑھا دی۔ اس کے بعد دوسری مرغی اٹھائی اور میزبان سے کہا ''آپ، آپ کے دو بیٹے اور ایک مرغی؛ یہ بھی کل ملا کر چار ہوئے''۔ پھر تھال میں موجود باقی تین مرغیاں اپنی طرف کھسکاتے ہوئے بولا ''میں اور یہ تین مرغیاں؛ یہ بھی کل ملا کر ہو گئے چار''۔ اس کے بعد مسکرایا، بے بسی کی تصویر بنے اپنے میزبانوں کی طرف دیکھا اور آسمان کی طرف منہ کرتے ہوئے کہنے لگا ''یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے تقسیم کرنے کی اعلیٰ صلاحیت سے نوازا ہے۔

چرچل اور سٹالن

شہزادہ مبشر گلاسگو

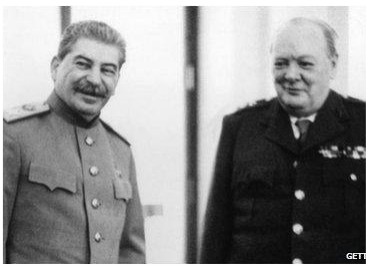

دوستو دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی، اس جنگ کے دوران دنیا کی تین بڑی طاقتوں کے درمیان سہ فریقی مذاکرات شروع ہوئے، موجودہ روس میں ہونے والے اس مزاکرات میں سوویت یونین کے سٹالن، برطانوی وزیر اعظم چرچل، اور امریکی صدر روز ویلٹ شریک تھے، مزاکرات کے دوران امریکی صدر روز ویلٹ نے کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر کچھ لکھا اور چرچل کے حوالے کر دیا، چرچل نے پڑھنے کے بعد اس کاغذ کے ٹکڑے کو سگریٹ کے زریعہ جلا کر ایش ٹرے میں پھنک دیا اور جواب میں ایک اور کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ تحریر کر کے روز ویلٹ کے حوالے کر دیا، روز ویلٹ نے وہ جواب پڑھا اور کاغذ کے ٹکڑے کو ایش ٹرے میں ویسے ہی پھنک دیا، کیونکہ روز ویلٹ سموکنگ نہیں کرتا تھا اس لئے وہ اس ٹکڑے کو جلا نہ سکا، جیسے ہی یہ سب مذاکرات کی میز سے اٹھے سوویت انٹیلیجنس سروس کے کارندوں نے جا کر اس کاغذ کو تحویل میں لے لیا جو جل نہ پایا تھا، جب سوویت ایجنسیوں نے چرچل کے لکھے کاغذ کو پڑھا تو اس پر کوڈ ورڈ میں یہ جملہ لکھا ہوا تھا، ڈرنے کی ضرورت نہیں کسی بھی صورت میں پرانا عقاب گھونسلے سے نہیں اُڑ سکتا۔ سوویت انٹیلیجنس سروس نے ان الفاظ کا تجزیہ شروع کر دیا اور آخر کار نتیجہ نکالا گیا کے یہ ہمارے کسی بوڑھے شخص کو قتل کرنے کے بارے میں بات ہو رہی تھی، اور وہ بوڑھا کوئی اور نہیں ہمارا صدر سٹالن ہی ہے، انہوں نے اس کوڈ کا مطلب سمجھنے کے لیے مذہبی کتاب بائبل، مغرب کے مشہور مصنف شیکسپیئر سمیت مختلف لوگوں کی کتابوں سے بھی مدد لی کہ آخر اس جملے کا مطلب کیا ہوسکتا ہے، یہ بات تو روسیوں پر واضح ہوگئی تھی کہ یہ سوویت صدر کو قتل سے مطلق بات چیت ہے اور اس جملے میں پرانا عقاب سٹالن ہے، اور گھونسلا سوویت یونین ہے۔ احتیاطی تدابیر شروع کر دی گئیں، صدر کے گارڈز کو تبدیل کیا گیا، خفیہ ایجنٹ بڑھا دیئے گئے، اور اس کے علاوہ تمام ضروری سامان اور گولہ بارود کے ذخائر کی حفاظت کا بھی دوبارہ نیے سرے سے بندوبست کیا گیا، مزاکرات ختم ہو گے تمام رہنما خاموشی سے اپنے ممالک کی طرف روانہ ہو گئے لیکن کچھ نہ ہوا، ان مزاکرات کے کئی سال بعد سوویت یونین سے تعلق رکھنے والا ایک مترجم جو مزاکرات میں شریک تھا اور اس سارے قصے کو جانتا تھا اتفاق سے چرچل کو کسی تقریب میں ملا اور باتوں باتوں میں چرچل سے اس کے لکھے مبہم اور خطرناک جملے کا مطلب پوچھ بیٹھا جس پر قہقہ لگاتے ہوئے چرچل نے جواب دیا بھائی اس دن جب مزاکرات ہو رہے تھے روز ویلٹ نے مجھے ایک پرچی دی جس پر لکھا تھا کے مسٹر چرچل، آپ کی پتلون کی زپ کھلی ہے مہربانی کر کے بند کر لیں میں نے وہ پرچی پڑھی اور پھر ایش ٹرے میں جلا دی اور دوسری پرچی پر میں نے جواب لکھا کہ بھائی ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں یہ پرانا عقاب ہے اپنے گھونسلے سے اُڑ نہیں سکے گا!۔

نتیجہ: دوستو اپنے آپ کو سیاسی تجزیوں میں بہت زیادہ غرق نہ کیا کریں اور ان سازشوں کے تانے بانے نہ بنا کریں کیوں کہ جو نظر آتا ہے اکثر ویسا بلکل بھی نہیں ہوتا۔

تمثیلی افسانہ مایوسی

اسماء صبا خواج لکھیم پور کھیری انڈیا

چار دوست آپس میں ایک دوسرے کے جگری دوست ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ سچی دوستی بھی نبھاتے ہیں ان چاروں دوستوں کے نام بہت اہم ہیں۔ پہلا دوست امید دوسرا دوست صبر۔ تیسرا دوست رحمت چوتھا دوست ایمان اور چاروں دوست اللہ کے بہت قریب بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن ان چاروں دوستوں کی ایک دشمن بھی ہے جسکا نام مایوسی ہے۔ ایک دن امید کا جھگڑا مایوسی سے ہوتا ہے اور مایوسی امید سیکھتی ہے کہ میں سب پر بھاری ہوں۔ لیکن امید تو امید ہے امید کہتی ہے کہ تم تو صرف انسانیت کو کھوکھلا بنانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرتی اور وہ جو تمہارا ساتھی غم ہے نہ جو انسان کو کھا جاتا ہے۔

اسی لیے تم کو ہماری فہرست میں نہیں رکھا گیا۔ اس بات پر مایوسی امید سے کہتی ہے تم لوگ تو بے بس ہو صرف اپنے اللہ سے دعا کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتے ہو اور مجھے دیکھو میں نے انسان کو اپنے بس میں کر رکھا ہے جو شراب، نشہ خوری، جواں، چوری، ڈکیتی، مار کاٹ، جھگڑا فساد، اور خون خرابے کے چکر میں ہے ان سے میرا پیٹ بھرتا ہے یہ سب کے سب ہماری خوراک ہیں۔ اس پر صبر کو بہت غصہ آتا ہے اور مایوسی سے کہتا ہے دعا مومن کا ہتھیار ہے۔ صبر کہتا ہے کہ میں پوری دنیا پر غالب آ گیا میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا میں نے اپنی طاقت سے بڑے بڑے کارنامے جیت لیے ہیں۔ تم مایوسی بیشک اندھیرے کی مانند ہو اور ہر ہونیوالی اندھیری رات کے بعد چمکتی ہوئی صبح ضرور ہوتی ہے۔ درمیان میں دوست ایمان آ کر کہتا ہے ہمارے نبیوں کو اللہ نے آزمائش میں ڈالا اور سخت مراحل ومشکلات سے گزارا گیا۔ لیکن انہوں نے اپنے ایمان پر ڈاکہ نہیں ڈالا اور صبر کا دامن مضبوطی سے ہمیشہ تھامے رکھا بڑی بڑی جنگوں میں آسانی کے ساتھ فتح حاصل کی۔ پھر رحمت آ کر بولتی ہے کہ آخر اللہ نے ان پر اپنی رحمت برسانی ہی شروع کر دی اور آخر اے مایوسی تیرا ہی زوال آ کر رہا یعنی اب تیری زندگی بہت کم ہے۔

امید کہتی ہے کہ اے مایوسی اگر تو انسان کیلیے آدھی موت ہے تو یہ مت بھولنا میں بھی انسان پر آدھی زندگی بنکر غالب ہوں۔

تب رحمت کہتی ہے کہ بیشک کتنی بھی مشکل پیش آ جائیں لیکن ہمیشہ یہی سوچو کہ سب ٹھیک ہو جائیگا اور ہاں مایوسی سے ہارنا نہیں چاہیے بلکہ مایوسی کو ہرگز ہرا دینا چاہیے۔ اور امید تو بڑے کام کی چیز ہے یہ تو سبکو سنبھال کر رکھتی ہے۔ اور ایمان کہتا ہے کہ مایوسی ایمان کی کمزوری ہے اور کفر ہے۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے۔ لا تقنطوا من رحمت اللہ

اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان کو کبھی بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ مشکلات کے آنے پر، مایوسی کے اندھیروں میں بھی امید اور صبر کا دامن تھامے رکھیے صبر ایک ایسی سواری ہے جو ہر مشکل میں بڑی آسانی کے ساتھ مشکل راستوں کو پار کرواتا ہے۔ اور مشکلات کا ایک ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونیدیتا اور ہر مشکل لمحات میں صبر اپنے دوست رحمت کو ساتھ ضرور لیکر آتا ہے۔ اور پھر یہ چاروں دوست ملکر امید، صبر، رحمت، اور ایمان اپنی دشمن مایوسی کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ اور جشن منا کر سب بولتے ہیں ہم سب ملکر اللہ کے فضل وکرم سے کامیابی کی منزل طے کر لیتے ہیں۔

***

وزارت انتظامی امور برائے گھڑا وزیر تعلیم

عاصی صحرائی

گھڑے کی کہانی کہا جاتا ہے کہ کسی بادشاہ کا گزر اپنی سلطنت کے ایک ایسے علاقے سے ہوا جہاں کے لوگ سیدھا نہر سے ہی پانی لیکر پیتے تھے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ عوام الناس کی سہولت کیلیئے یہاں ایک گھڑا بھر کر رکھ دیا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا اور ہر چھوٹا بڑا سہولت کے ساتھ پانی پی سکے گا۔ بادشاہ یہ کہتے ہوئے اپنی باقی کے سفر پر آگے کی طرف بڑھ گیا۔ شاہی حکم پر ایک گھڑا خرید کر نہر کے کنارے رکھا جانے لگا تو ایک اہلکار نے مشورہ دیا یہ گھڑا عوامی دولت سے خرید کر شاہی حکم پر یہاں نصب کیا جا رہا ہے۔ضروری ہے کہ اس کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے اور ایک سنتری کو چوکیداری کیلیئے مقرر کیا جائے۔سنتری کی تعیناتی کا حکم ملنے پر یہ قباحت بھی سامنے آئی کہ گھڑا بھرنے کیلیئے کسی ماشکی کا ہونا بھی ضروری ہے۔اور ہفتے کے ساتوں دن صرف ایک ماشکی یا ایک سنتری کو نہیں پابند کیا جا سکتا، بہتر ہوگا کہ سات سنتری اور سات ہی ماشکی ملازم رکھے جائیں تا کہ باری باری کے ساتھ بلاتعطل یہ کام چلتا رہے۔ایک اور محنتی اہلکار نے رائے دی کہ نہر سے گھڑا بھرا ہوا اُٹھا کر لانا نہ تو ماشکی کا کام بنتا ہے اور نہ ہی سنتری کا۔اس محنت طلب کام کیلیئے سات باربردار بھی رکھے جانے چاہیئں جو باری باری روزانہ بھرے ہوئے گھڑے کو احتیاط سے اُٹھا کر لائیں اور اچھے طریقے سے ڈھکنا لگا کر بند کر کے رکھیں۔ایک اور دور اندیش مصاحب نے مشورہ دیا کہ اتنے لوگوں کو رکھ کر کام کو منظم طریقے سے چلانے کیلیئے ان سب اہلکاروں کا حساب کتاب اور تنخواہوں کا نظام چلانے کیلیئے منشی محاسب رکھنے ضروری ہونگے، اکاؤنٹنگ کا ادارہ بنانا ہوگا، اکاؤنٹنٹ متعین کرنا ہونگے۔

ایک اور ذی فہم وفراست اہلکار نے مشورہ دیا کہ یہ اسی صورت میں ہی یقینی بنایا جا سکتا ہے کہ ہر کام اچھے طریقے سے چل رہا ہے تو ان سارے ماشکیوں، سنتریوں اور باربرداروں سے بہتر طریقے سے کام لینے کیلیئے ایک ذاتی معاملات کا ایک شعبہ قائم کرنا پڑے گا۔ایک اور مشورہ آیا کہ یہ سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے مگر ملازمین کے درمیان میں لڑائی جھگڑا یا کوئی زیادتی ہو جاتی ہے تو ان کا تصفیہ اور ان کے درمیان میں صلح صفائی کون کرائے گا؟ تا کہ کام بلاتعطل چلا رہے، اس لیئے میری رائے میں خلاف ورزی کرنے والوں اور اختلاف کرنے والوں کی تفتیش کے لیے ایک قانونی اُمور کا محکمہ قائم کیا جانا چاہیے۔ان سارے محکموں کی انشاء کے بعد ایک صاحب کا یہ مشورہ آیا کہ اس سارے انتظام پر کوئی ہیڈ بھی مقرر ہونا چاہیئے۔ایک ڈائریکٹر بھی تعینات کر دیا گیا۔ سال کے بعد حسب روایت بادشاہ کا اپنی رعایا کے دورے کے دوران اس مقام سے گزر ہوا تو اس نے دیکھا کہ نہر کے کنارے کئی کنال رقبے پر ایک عظیم الشان عمارت کا وجود آ چکا ہے جس پر لگی ہوئی روشنیاں دور سے نظر آتی ہیں اور عمارت کا دبدبہ آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔ عمارت کی پیشانی پر نمایاں کر کے وزارت انتظامی امور برائے گھڑا کا بورڈ لگا ہوا ہے۔بادشاہ اپنے مصاحبین کے ساتھ اندر داخل ہوا تو ایک علیحدہ ہی جہان پایا۔عمارت میں کئی کمرے، میٹنگ روم اور دفاتر قائم تھے۔ایک بڑے سے دفتر میں، آرام کرسی پر عظیم الشان چوبی میز کے پیچھے سرمئی بالوں والا ایک پروقار معزز شخص بیٹھا ہوا تھا جس کے سامنے تختی پر اس کے القابات پروفیسر ڈاکٹر دو جنگوں کا فاتح فلان بن فلان ڈائریکٹر جنرل برائے معاملات سرکاری گھڑا لکھا ہوا تھا۔ بادشاہ نے حیرت کے ساتھ اپنے وزیر سے اس عمارت کا سبب پوچھا، اور ساتھ ہی اس عجیب وغریب محکمہ کے بارے میں پوچھا جس کا اس نے اپنی زندگی میں کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ بادشاہ کے وزیر نے جواب دیا حضور والا، یہ سب کچھ آپ ہی کے حکم پر ہی تو ہوا ہے جو آپ نے پچھلے سال عوام الناس کی فلاح اور آسانی کیلیئے یہاں پر گھڑا نصب کرنے کا حکم دیا تھا۔ بادشاہ مزید حیرت کے ساتھ باہر نکل کر اس گھڑے کو دیکھنے گیا جس کو لگانے کا اس نے حکم دیا تھا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ گھڑا نہ صرف خالی اور ٹوٹا ہوا ہے بلکہ اس کے اندر ایک مرا ہوا پرندہ بھی پڑا ہوا ہے۔ گھڑے کے اطراف میں بیشمار لوگ آرام کرتے اور سوئے ہوئے پڑے ہیں اور سامنے ایک بڑا بورڈ لگا ہوا ہے گھڑے کی مرمت اور بحالی کیلیئے اپنے عطیات جمع کرائیں۔

منجانب: وزارت انتظامی امور برائے گھڑا وزیر تعلیم

جب امریکہ میں غلامی اپنے عروج پر تھی تو ایک ہیریٹ نامی خاتون نے خفیہ تنظیم بنائی۔ جو غلاموں کو بھاگ جانے میں مدد کرتی تھی، ایک دفعہ اُس خاتون سے پوچھا گیا تمہارے مشن میں سب سے مشکل مرحلہ کونسا تھا؟ تو اُس نے کہا کہ ''غلام کو ترغیب دینا کہ تم غلام نہیں ہو اور آزاد ہو سکتے ہو۔''

WWW.URDUSAFHA.COM

اردو ڈائجسٹ ۔ ایڈیٹر مجیب الرحمن شامی

کھوٹا سکہ

(اسے ضرور پڑھنا) یہ ستمبر 1948 کی بات ہے جب ہندوستان نے ریاست جونا گڑھ پر یہ کہہ کر قبضہ کرلیا کہ ریاست کا حکمران (نواب مہابت خان) لاکھ مسلمان سہی مگر ریاستی عوام کی اکثریت تو ہندو ہے جب کہ اس استعماری ریاست نے جموں و کشمیر پر قبضہ کرتے ہوئے۔۔خیر قصہ مختصر یہ کے جونا گڑھ پر بھارتی قبضہ کے بعد نواب مہابت خان بروقت تمام اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی جان بچا کر اور مختصر ضروری سامان لے کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔یہاں انہوں نے اُس وقت کے دارالحکومت کراچی کے مشہور علاقے کھارادر میں قیام کیا یہ وہی علاقہ ہے جہاں کی ایک سڑک پروز یرمینشن نام کی وہ سہ منزلہ عمارت واقع ہے جسے قائداعظم کی جائے پیدائش ہونے کا اعزاز حاصل ہے نواب صاحب اپنے سرکاری خزانے میں 48 من سونا چھوڑ آئے تھے اور وہ ایسی جگہ پر محفوظ تھا جس کا علم نواب صاحب کے سوا کسی کو نہیں تھا اگر ہندوستانی افواج پورا محل بھی کھود کر پھینک دیتیں تو انہیں سونا نہ ملتا نواب صاحب کی خواہش یہ تھی کہ وہ سونا کِسی طرح پاکستان لایا جاسکتا ہو وہ اُس کا نصف حصہ سرکار پاکستان کے خزانہ میں جمع کرادیں گے اِس امر سے تو ہر ذی علم واقف ہے کہ اُن دِنوں پاکستان انتہائی بحران کا شکار تھا اگر چند محب وطن لوگ اِس نوزائیدہ ملک کی مدد نہ کرتے تو خاکم بدہن چند ماہ کے اندر ہی اس کا وجود ختم ہوسکتا تھا نواب صاحب خلوص دل کے ساتھ پاکستان کی خدمت کرنا چاہتے تھے اگر وہ 24 من سونا پاکستان کے خزانے میں جمع کرادیا جائے تو ملکی معیشت خاصی بہتر ہوسکتی تھی مگر سوال یہ تھا کہ اُسے لایا کس طرح جائے اور کون لے کر آئے؟ ہندوستان جیسا کمینہ ملک شرافت کے ساتھ تو ریاست کی امانت اُس کے حکمران کے حوالے نہ کرتا اب تو ایک ہی صورت باقی بچی تھی غیر قانونی ذریعہ مگر حقیقتا سونے کو خفیہ طریقے سے پاکستان منتقل کرنا ہندوستان کی نظر میں تو غیر قانونی ہوسکتا تھا مگر پاکستان یا نواب مہابت خان کے لئے نہیں کیونکہ یہ زر کثیر نواب صاحب کی ملکیت تھا اب کردار شروع ہوتا ہے کھوٹے سکے کا وہ تھے اُس دور کا مشہور سمگلر حاجی عبداللہ بھٹی جو سمندر پار بستی صالح آباد میں رہائش پذیر تھے یہ بستی کراچی کی بندرگاہ کیماڑی سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر واقع ہی عبداللہ بھٹیا اس وقت اُسی برس کے تھے اور اپنا پیشہ ترک کرکے یادِ الٰہی میں مصروف تھے نواب مہابت خان کو جب اِس بارے میں علم ہوا تو انہوں نے پاکستان کی ایک نہایت قابل احترام اور اعلیٰ ترین شخصیت سے درخواست کی کہ وہ اپنے اثر ورسوخ سے عبداللہ بھٹی کو اِس بات پر راضی کرلیں کہ وہ کسی بھی صورت اُن کا سونا جونا گڑھ کے خزانے سے نکال لائیں اُس محترم ہستی نے عبداللہ بھٹی کو اپنے روبرو طلب کرکے ملک وقوم کی خاطر یہ کام کرنے پر آمادہ کرلیا جونا گڑھ سمندر کے راستے کراچی سے تین سو میل دور ہی عظیم شخصیت کے حکم پر بوڑھے مگر پرعزم عبداللہ بھٹی اپنے بیٹوں قاسم بھٹیا اور عبدالرحمن بھٹی کو ساتھ لیکر تیز رفتار لانچوں کے ذریعے جونا گڑھ روانہ ہوگئے پاکستانی فوج کے چند کمانڈوز بھی اُن کے ساتھ تھے اِن لوگوں نے ایک بجے دوپہر کو بحری سفر شروع کیا اور خفیہ راستوں سے ہوتے ہوئے جونا گڑھ کے ساحل پر پہنچ گئے۔

اُس وقت شب کے 10 بجے تھے شاہی محل ساحل سمندر سے کچھ زیادہ دور نہ تھا پاکستانی کمانڈوز نے ساحل پر متعین بھارتی فوج کے افسران ور سپاہیوں کا خاتمہ کیا اب دیکھیے سمگلر کا حسن کردار جب اُنہوں نے انتہائی اعلیٰ شخصیت کی موجودگی میں 48 من سونا نواب مہابت خان کو پیش کیا تو جہاں نواب صاحب نے حسب وعدہ 24 من سونا حکومت پاکستان کی نذر کیا وہیں اپنے حصے میں آنے والے 24 من سونے میں سے 4 من سونا حاجی عبداللہ بھٹی کو بطور انعام پیش کیا حاجی عبداللہ بھٹی نے یہ سونا لینے سے انکار کردیا اور زار وقطار روتے ہوئے بولے'بابا'میں نے ساری زندگی سمگلنگ کی مگر وہ انگریز کا زمانہ تھا اب میں نے سمگلنگ نہیں کی بلکہ پاکستان کا حق حاصل کیا ہمیں سمگلر ضرور ہوں مگر مادر وطن کی دولت نہیں لوٹوں گا پھر دوبارہ رونے لگ گئے کچھ دیر بعد خاموش ہوئے اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے میں یہ چار من سونا بھی حکومت پاکستان کے خزانے کے لیے پیش کرتا ہوں اِس کے علاوہ میرے پاس ذاتی ۳ من سونا ہے جو اِس مقدس دیس کی نذر ہے پھر اُس عظیم ہستی اور نواب مہابت خان کے آنسو بھی نہ رک سکے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔فخر و انبساط کے آنسو اور ایک ہمارے اِس دور کے کھوٹے نہیں بلکہ گندے سکے ہیں جو پاکستان کی دولت کو لوٹ کر دوسرے ملکوں میں لے گئے مگر نہ شرم ہیں نہ حیا تو ان کو کیا نام دیا جائے؟

(منقول)

ہر وہ ملک جس کے بادشاہ، حکمران، وزیر، مشیر، بیوروکریٹس اور تاجر بڑے گھروں، بڑے دفتروں میں رہتے ہیں

وہ ملک وہ معاشرہ زوال پذیر ہوگا''۔میں خاموشی سے سنتا رہا، انہوں نے فرمایا پورا عالم اسلام بڑے گھروں کے خبط میں مبتلا ہے، اس وقت دنیا کا سب سے بڑا محل برونائی کے سلطان کے پاس ہے، عرب میں سینکڑوں ہزاروں محلات ہیں اور ان محلات میں سونے اور چاندی کی دیواریں ہیں، اسلامی دنیا اس وقت قیمتی اور مہنگی گاڑیوں کی سب سے بڑی مارکیٹ ہے''۔تم پاکستان کو دیکھو، تم ایوان صدر، وزیراعظم ہاؤس، گورنر ہاؤسز، کور کمانڈر ہاؤسز، آئی جی، ڈی آئی جی ہاؤسز، ڈی سی اوز ہاؤس اور سرکاری گیسٹ ہاؤسز کو دیکھو، یہ سب کیا ہیں؟ یہ سب بڑے گھر ہیں، پاکستان کے ایک ضلع میں 18 ویں گریڈ کے ایک سرکاری عہدیدار کا گھر 106 کنال پر مشتمل ہے، اسلام آباد کے وزیراعظم ہاؤس کا رقبہ قائداعظم یونیورسٹی کے مجموعی رقبے سے چار گنا ہے، لاہور کا گورنر ہاؤس پنجاب یونیورسٹی سے بڑا ہے، اور ایوان صدر کا سالانہ خرچ پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کے مجموعی بجٹ سے زیادہ ہے۔میں خاموشی سے سنتا رہا. پھر بولے: تم لوگ اپنے حکمرانوں کے دفتر دیکھو، ان کی شان وشوکت دیکھو، ان کے اخراجات اور عملہ دیکھو، کیا یہ سب فرعونیت نہیں؟ کیا اس سارے تام جھام کے بعد بھی اللہ تعالیٰ ہم سے راضی رہے گا؟؟ جبکہ اس کے برعکس تم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کا لائف سٹائل دیکھو، بل گیٹس دنیا کا امیر ترین شخص ہے، دنیا میں صرف 18 ممالک ایسے ہیں جو دولت میں بل گیٹس سے امیر ہیں، باقی 192 ممالک اس سے کہیں غریب ہیں، لیکن یہ شخص اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتا ہے، وہ اپنے برتن خود دھوتا ہے، وہ سال میں ایک دو مرتبہ ٹائی لگاتا ہے، اور اس کا دفتر مائیکروسافٹ کے کلرکوں سے بڑا نہیں. وارن بفٹ دنیا کا دوسرا امیر ترین شخص ہے. اس کے پاس 50 برس پرانا اور چھوٹا گھر ہے، اس کے پاس 1980ء کی گاڑی ہے، اور وہ روز کوکا کولا کے ڈبے سٹورز پر سپلائی کرتا ہے۔برطانیہ کے وزیراعظم کے پاس دو بیڈروم کا گھر ہے. جرمنی کی چانسلر کو سرکاری طور پر ایک بیڈروم اور ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم ملا ہے۔اسرائیل کا وزیراعظم دنیا کے سب سے چھوٹے گھر میں رہ رہا ہے، کبھی کبھار اس کی بجلی تک کٹ جاتی ہے۔بل کلنٹن کو لیونسکی کیس کے دوران کورٹ فیس ادا کرنے کے لئے دوستوں سے ادھار لینا پڑا تھا۔وائیٹ ہاؤس کے صرف دو کمرے صدر کے استعمال میں ہیں، اوول آفس میں صرف چند کرسیوں کی گنجائش ہے۔جاپان کے وزیراعظم کو شام چار بجے کے بعد سرکاری گاڑی کی سہولت حاصل نہیں چنانچہ تم دیکھ لو چھوٹے گھروں والے یہ لوگ ہم جیسے بڑے گھروں والے لوگوں پر حکمرانی کر رہے ہیں.... یہ ممالک آگے بڑھ رہے ہیں اور ہم دن رات پیچھے جا رہے ہیں۔

جستہ جستہ

عطاء القادر طاہر

معاشرے کو تیزاب سے غسل کی ضرورت

ہے کہ نہیں....فیصلہ آپ کے ضمیر پر چھوڑتا ہوں۔۔!

ایک شادی پر جانا ہوا، ہال کے ایک کونے پر نظر گئی تو ایک جان پہچان والے شخص پر نظر پڑی جو اکیلا ہی بیٹھا تھا اس کے ساتھ جا کر میں بھی بیٹھ گیا۔بڑی گرمجوشی سے ملا وہ شخص اس کا گاڑیوں کے پرزے اور انجن آئل وغیرہ کا کام ہے حال احوال پوچھنے کے بعد وہی عام طور پر کی جانے والی باتیں شروع ہوگئیں یعنی مہنگائی اور کاروباری مندے کا رونا کہنے لگا.... آج کل کام کوئی نہیں چل رہا ابھی پرسوں کی بات ہے، ایک بندے نے گاڑی کا آئل تبدیل کروایا پینتیس سو بل بنا اس نے پیسے دیئے اور چلا گیا بعد میں پتا چلا کہ ایک ہزار کا نوٹ جعلی دے گیا وہ میرے منہ سے نکلا، پھر؟؟؟ پھر کیا بڑی گالیاں نکالی اسے پتا نہیں کون تھا پہلی بار آیا تھا. وہ تو شکر ہے میں نے آئل ہی ''جعلی'' ڈالا اس کی گاڑی میں ورنہ میں تو مارا جاتا۔!اسی دوران'' کھانا کھل گیا'' کا نعرہ لگا اور پورے ہال میں گویا بھونچال آ گیا وہ مرغی کے قورمے کا ڈھیر پلیٹ میں لئے فاتحانہ انداز لیے واپس آ گیا میں سمجھا شاید میرے لئے بھی لے آیا کھانا کہنے لگا پاجی لے آؤ آپ بھی بعد میں تو شادی ہال والے خراب کھانا دینا شروع کر دیتے ہیں میں اُٹھا اور بریانی لے کر واپس آ گیا اور اس سے پوچھا، اس جعلی ہزار کے نوٹ کا کیا کیا تم نے؟ کرنا کیا ہے لڑکے والوں نے شادی پر بلایا ہے دُولہے کے والد کو سلامی میں دے دیا وہ نوٹ اور میز کے نیچے چھپائی ہوئی چار بوتلوں سے ایک نکال کر دو گھونٹ میں خالی کر دی اور چھ سیکنڈ دورانیے کا لمبا ڈکار لینے کے بعد دونوں ہاتھ جوڑے عقیدت سے آنکھیں بند کیں اور بولا شکر الحمدللہ اور میں نے سوچا میزبان نے جعلی نوٹ دیکھ کر بولا ہوگا شکر ہے مردہ مرغیاں پکوائی تھیں۔اے اللہ تو اس قوم پر رحم کر۔

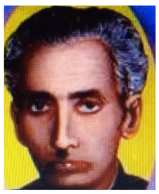

جاوید اختر علی آبادی

نشورؔ واحدی کی سحر آفریں لے

شاعری میں شخصیت کا عکس جھلکتا ہے بلکہ عکسِ ذات الفاظ میں تحلیل ہوکر شعری قالب اختیار کر لیتا ہے۔ زندگی اور تجرباتِ زندگی سے ہمکنار ہوکر شاعر اپنے جذبات واحساسات کو شعری پیکر میں ڈھالتا ہے۔ یہ شعری پیکر کبھی غمِ عشق کے سلگتے ہوئے جذبات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی غمِ دنیا کی صورت میں اور ان سب کا ذکر بہتر انداز میں گلدستۂ غزل میں ہوتا ہے۔ جہاں نقش ونگارِ حسن کا ربط بھی ہے اور بے ربطگی بھی، ترتیب بھی ہے اور بے ترتیبی بھی، تسلسل بھی ہے اور منتشر خیالی بھی، ساتھ ہی ساتھ دلکشی ودلآویزی بھی ہے اور کیوں نہ ہو جب اس میں بہار کی رعنائیاں، موسمِ گل کی طرب زائیاں حسن بے محابا کی رنگینیاں اور باغِ دبستاں کی کیفیتیں موجود ہیں۔ چنانچہ اسی گلستانِ حسن کا ایک طائر خوش نوا نشورؔ ا بھی ہے جس کی مترنم آواز میں حیا آلود شوخی اور تخیل کی پاکیزگی ہے۔ اسکے یہاں چشم میگوں، گلگونۂ عارض، خرامِ ناز، زلفِ شبگوں، آہستہ خرامی، دلفریبی وجاذبیت اور والہانہ لطافتیں غرض کہ جمالِ حیات وکائنات کی بوقلمونی جلوہ گر ہے۔ وہ خالص غزل کا شاعر ہے۔ اس کے یہاں حسنِ نظر، جمالیاتی شعور، نزاکتِ احساس، سادگی اور بے تکلفی، لہجے کی نرمی اور گرمی غرض یہ تمام زاویۂ جذبات واحساسات ایک ساتھ تحلیل ہوکر شعری جامہ میں نظر آتے ہیں۔ زندگی اور محبت کے حادثات اور ان کے ردِعمل کی گونج یا صدائے بازگشت نشورؔ کے یہاں نظر آتی ہے۔ وہ کبھی کہسارِ غم میں پناہ گزیں ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو عصری مسائل کی ڈور سلجھانے میں محو نظر آتے ہیں۔ ان کی طبیعت جہاں ایک طرف گلشنِ فطرت کے غنچۂ نو دیدہ کی نکہتوں سے معمور ہے وہیں دوسری طرف سفرِ حیات کی صعوبتوں سے بھی دلبستگی ہے۔ بہرحال نشورؔ کے کلام میں غزل کی لطافت اور پاکیزہ مزاجی نمایاں ہے۔ وہ غزل کے فن سے واقف ہی نہیں بلکہ اس پر دسترس رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں غنائیت اور موسیقیت کی سحر انگیز فضا ہر ہر شعر میں نمایاں ہے۔

نشورؔ کا مجموعۂ کلام ''آتش ونم'' کے نام سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا جس میں نظمیں اور غزلیں ہیں۔ لیکن یہاں ہمارا موضوعِ تحریر غزل ہے۔ اس لیے غزل کے پس منظر میں نشورؔ کی فطرت ومزاج کا جائزہ لینا ہے۔

مذکورہ مجموعہ میں جہاں ایک طرف غمِ زندگی کے نغمے ہیں وہیں دوسری طرف شباب اور رنگینیٔ شباب کی شوخی بھی ہے۔ ایک طرف غم کی آنچ میں سلگتے ہوئے جذبات ہیں تو دوسری طرف عنفوانِ شباب کے کیف پرور نغمے ہیں۔ جہاں ایک طرف فطرت کی گہرائیوں اور نبضِ انسانی کی دھڑکنوں کی رمز شناسی نظر آتی ہے اور اس کے اسرار ورموز کی جھلک دکھائی پڑتی ہے وہیں دوسری طرف عصری ہنگاموں کی تصویر کشی بھی نظر آتی ہے۔ دراصل اشعار کے ملبوس میں نشورؔ کی ذات پوشیدہ ہے اور یہ وہ ذات ہے جو

''یار کی بزمِ ناز میں گزری ہوئی جوانیاں''

اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ بطور مثال چند مصرعے اور اشعار درج ذیل ہیں جن میں اسیرِ گیسوئے جاناں کی کیفیت بھی ہے اور عصری حسیت بھی، ساتھ ہی ساتھ غم کی کسک بھی نمایاں ہے بلکہ یہی وہ عنصر ہے جسے شاعر نے کئی جگہ اپنے شعر میں پیش کیا ہے ؎

''لہجے سے نشورؔ اپنے عیاں ہے غمِ ہستی''

''غم زدہ تھا دل نشورؔ شعر میں بہل گیا''

''غمِ ہستی کو ذوقِ شعر کرتا جارہا ہوں میں''

گلستاں کی بہاروں میں زہے تشریف ارزانی
وہ یوں آئے کہ شرما گئی پھولوں کی نکہت بھی

فطرت جگارہی ہے کمسن جوانیوں کو
سویا ہوا ہے محشر اک حسنِ بے خبر میں

وہ آئے اس طرف اور یوں بہ طرزِ خوشگوار آئے
اچانک جیسے محفل میں کہیں پھولوں کا ہار آئے

مجھ کو حیات کے سوا چاہیے اک غمِ حیات
طبعِ غمِ آفریں مری رہ نہ سکی حیات پر

غمِ یار وغمِ ہجر و غمِ آشفتہ سامانی
بہت غم کھاچکے اب کیا غمِ دنیا سے عار آئے

یہاں چند اشعار اور درج کررہا ہوں جن میں اپنے عہد کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان اشعار میں کہیں سرمایہ داریٔ نظام کے خلاف صدائے احتجاج ہے اور ایک نئے سماج کی تعمیر وتشکیل کا اظہار ہے تو کہیں اہلِ دُول کے نام پیغام ہے کہ مفلس کے ساتھ ظلم وبربریت کا کھیل خطرہ سے خالی نہیں اور کہیں سیاسی وسماجی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔ یہاں اس طرف بھی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ان اشعار میں اگرچہ الفاظ روایتی ہیں مثلاً جبیں، ستارے، شراب، مینا کشو اور صہبا وغیرہ لیکن ان الفاظ کے ذریعہ سیاسی وسماجی احوال وحوادث کی ترجمانی کی گئی ہے ؎

دولت کا فلک توڑ کے عالم کی جبیں پر
مزدور کی قسمت کے ستارے نکل آئے

شرابِ عیش کے مینا کشو یہ سوچ کر پینا
پسینہ ہے کسی کی موت کا صہبائے عشرت بھی

نشورؔ کا ایک اور مجموعۂ کلام ۱۹۶۸ء میں ''سوادِ منزل'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں ''صہبائے ہند''، ''آتش و نم'' اور ''فروغِ جام'' کی غزلوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک نشورؔ نے کچھ اور غزلیں لکھی تھیں، جنھیں نئی غزلوں کے عنوان سے شامل کر دیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کی مشمولہ غزلیں تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا مجموعے سے ظاہر ہے۔ پہلا حصہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک، دوسرا حصہ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک اور تیسرا حصہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک ہے۔ اس مجموعہ کے پہلے حصہ میں درج غزلوں کا سابقہ اقتباس میں تفصیلی تجزیہ کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس حصہ کی غزلوں پر اجمالی نظر ڈالتے ہیں تو یہ کہنا آسان ہو جاتا ہے کہ شاعر حسنِ فطرت کی دلفریب رعنائیوں میں محو ہے۔ حسن کے اتھاہ جلوے جذبات و واردات کے طوفانی تھپیڑوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شباب کے نغمے لہائے رنگیں پر آتے ہیں جو احساسِ زندگی میں جھوم کر کہے گئے ہیں۔ اس دور کے کلام میں کہیں پیکرِ شباب کا ذکر ہے تو کہیں منزلِ شباب تک رسائی کی کیفیت ہے، کہیں گھنیری زلفوں کے سائے کی باتیں ہیں تو کہیں یادِ جمالِ یار کا تذکرہ ہے۔ غرض یہ کہ زندگی کے احوال و کوائف کا ایک عالم نظر آتا ہے، جس میں تمنائیں مضطرب ہیں اور شوق حصول کی انگڑائیاں لیتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج ہیں ؎

گزرا مرے قریب سے اک پیکرِ شباب
نیچی نظر میں حشر کا ساماں لیے ہوئے
نشورؔ ان کے غرورِ حسن کا دامن پکڑ لوں میں
لیکن مری کمندِ شوق پر الزام آتا ہے

اس کے علاوہ کچھ ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں انقلابِ زمانہ کی جھلک دکھائی پڑتی ہے لیکن اس قسم کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ کیوں کہ شاعر ابھی گلستانِ حسن کی سیر میں مست و سرشار ہے۔ اس کا شعور ابھی آغوشِ شباب میں پرورش پا رہا ہے۔

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک کا کلام بھی پہلے دور کی طرح ہے۔ بہارِ حسن اور گرمیٔ حسن کا تذکرہ ہے۔ شباب اور متعلقاتِ شباب کی رنگینیاں ہیں۔ گلشنِ ہستی کے رنگا رنگ پھولوں کا بیان ہے۔ شاعر جمالِ حیات کے عمیق سمندر میں غوطہ زنی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ جوانی کی دلکشی کو عالمِ غنودگی میں بیان کرتا ہے۔ گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی سحر آفریں آواز سے صبا کی نرم رو میں نغمہ الاپ رہا ہو جس سے دل کا ہر تار بیدار ہے۔ اس طرح جذبات و احساسات، تصورات و نظریات، خیالات و کیفیات نے الفاظ کا جامہ پہن رکھا ہے اور الفاظ کا زیر و بم سمندر کی موجوں کی طرح سکون سے اضطراب کی طرف واپس آ رہا ہے۔

اس عہد کے کلام کی نمایاں خصوصیت شاعر کا گہرا اور تلخ مشاہدہ ہے، جس میں غور و فکر کا عنصر پہلے کی بہ نسبت زیادہ نظر آتا ہے ؎

وہ آئے بھی نہیں اور زندگی کی رات جاتی ہے
سحر ہوتی ہے اور شمعِ تمنا جھلملاتی ہے
راز ہے کچھ گریز میں بات ہے کچھ بچاؤ میں
ان کے شباب کا پتہ ان کے حجاب سے ملا
ہے جمالِ یار میں جزرومد جو مثال نغمۂ زیر و بم
یہ تغیراتِ شباب ہیں نشہ نہیں کہ اتر گیا

اس مجموعے کے آخری دور کا کلام جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک ہے، خصوصیت سے قابلِ توجہ ہے۔ کیوں کہ زمانہ کی روش نے اپنے اندر انقلابات و عزائم کے طوفانی تھپیڑوں کو چھپا رکھا ہے، جن کا عکس اس دور کے کلام میں صاف نظر آتا ہے۔ دراصل یہ زمانہ خلفشار کا زمانہ ہے، جبر و استبداد کا دور ہے۔ ہر طرف انقلابی نعروں کی بازگشت سنائی پڑتی ہے۔ گلشنِ ہستی کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے۔ گردشِ حیات میں سرگشتگی کی کیفیت نظر آتی ہے۔ راستے پیچیدہ ہو گئے ہیں۔

اس دور کے کلام میں نشورؔ نے خصوصیت کے ساتھ مسلم کارنامے اور تاریخِ مسلم کا ذکر کیا ہے۔ انھیں اس چیز کا شدید احساس ہے کہ اس قوم نے تاریخ کے انقلابی دھاروں کو گرفت میں لیا ہے۔ اسے راہِ راست پر لگایا ہے۔ اسے نکھارنے اور سنوارنے کے لیے اپنا لہو نذر کیا ہے۔ انہیں اس قوم کی خودداری کا بھی احساس ہے بلکہ ان کے مزاج میں یہ چیز پنہاں ہے جس کی جھلک اکثر اشعار میں مل جاتی ہے ؎

یہی کانٹے تو کچھ خوددار ہیں صحنِ گلستاں میں
کہ شبنم کے لیے دامن کو پھیلایا نہیں کرتے

کبھی کبھی وہ اہلِ حکومت کی وفا شعاری اور اس کی جفاکشی پر بھی طنز کرتے ہیں۔ آزادی کے وقت وہ راہبر کو بے وفا کہنے سے گریز کرتے ہیں لیکن جب یہ لوگ آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنا رویہ بدلتے ہیں تو انھیں بے وفا کہنے میں کوئی دریغ نہیں کرتے ؎

میں ابھی سے کس طرح ان کو بے وفا کہوں
منزلوں کی بات ہے راستے میں کیا کہوں
وہ نگاہیں بھی پھریں جن سے تھی امیدِ وفا

کوئی سمجھا نہیں اے دوست دنیا کیا ہے

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں جن میں احساسِ جمال کی لطافت موجود ہے اگرچہ اس قسم کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے لیکن نشورؔ کے اس موضوع کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ کششِ عشق اور طریقۂ عشق سے شناسائی ان کے یہاں تادمِ آخر نظر آتی ہے حالانکہ ایک جگہ نشورؔ یہ بھی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

نشورؔ اب غزل ہے حیاتِ دوعالم
یہ عنوانِ زلف و کمر اک بہانہ

یہ ادائے ملتفت ہے کہ حجابِ کم نگاہی
ترے رخ پہ رنگِ رخ کا یہ تھکا تھکا تلاطم

اس طرح اس دور کے کلام میں مذکورہ قسم کے اشعار بھی خال خال نظر آجاتے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے اس عہد کے کلام میں جدت و تجدد کا عنصر پایا جاتا ہے۔ بالخصوص روایتی الفاظ کے ذریعے عصری تقاضوں کے پورا کرنے کا رجحان و میلان نمایاں ہے۔ اس نوع کے اشعار میں الفاظ تو وہی ہیں جن سے میرؔ، غالبؔ اور حسرتؔ نے گلستانِ حسن کی آبیاری کی ہے لیکن نشورؔ نے انھیں نئے مفاہیم و مطالب عطا کیے ہیں۔ چمن، موج، ساحل، گیسو، تبسم، کلیاں، غنچہ و دہن، دریا، شمع، گل، نغمہ، وفا اور جفا، شبنم، دامن، بہار و خزاں، زلف اور نازک کلائیاں وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کے ذریعے سیاسی و سماجی مفہوم ادا کیا گیا ہے

میں دیکھتا ہوں وقت کی نازک کلائیاں
خنجر اٹھا سکیں گے نہ قاتل قریب ہے

اغیار کو گلِ پیرا ہنی ہم نے عطا کی
اپنے لیے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا

ٹکرائے کبھی موج سے ساحل پہ کبھی ہیں
بہتے ہوئے دریا میں وطن ہم نے بنایا

داغ ہوں لالۂ اقوامِ جہاں کے دل کا
میں بہاروں کے کلیجے پہ خزاں رکھتا ہوں

گل تبسم ریز ہیں لیکن چمن افسردہ ہے
شمع جلتی ہے مگر محفل بجھی پاتا ہوں

کہیں چراغ جلانے کی ہو رہی ہے سبیل
بجھا رہے ہیں یہاں شمع خود ہی پروانے

اس کے علاوہ اسی دور کی ایک غزل بعنوان ''یومِ آزادی'' ہے جس کے ہر ہر شعر میں سیاسی و سماجی عکاسی کی گئی ہے اگرچہ الفاظ روایتی ہیں لیکن معنویت بدل گئی ہے۔ نشورؔ کے کلام کو فنی حیثیت سے بھی امتیاز و اختصاص حاصل ہے۔ اس سلسلے میں صنائع و بدائع سے قطعِ نظر ہندی کے سبک اور شیریں الفاظ اردو الفاظ کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی شعوری کوشش خصوصیت سے قابلِ توجہ ہے۔ بطور مثال چند اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں حسنِ غارت گر کا بھی ذکر ہے اور سیاسی و سماجی حالات کا تذکرہ بھی ؎

ستاروں کا سہارا لے کے دھرتی بیٹھ جاتی ہے
میں دامن تھامتا ہوں اور ادا دامن چھڑاتی ہے

چڑھے ساون وہ اللہ رے کسی کا حسنِ روز افزوں
ہر اک چھینٹے پہ آبِ روئے زیبا بڑھتی جاتی ہے

کوئی آنسو، کوئی شبنم کوئی آکاش کی بوند
کوئی قطرہ نہیں دریا کا غلام اے ساقی

یہ تھا نشورؔ کی غزلوں کا مختصر جائزہ جس میں ان کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ نشورؔ نے زندگی اور محبت سے جو کچھ حاصل کیا اس روداد کی شعری تصویر صفحۂ قرطاس پر بنا دی ہے۔

حواشی: (۱) نشورؔ واحدی کا اصل نام حفیظ الرحمن تھا وہ ۱۵/اپریل ۱۹۱۲ء کو ضلع بلیا کے قصبہ شیخ پور میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں کانپور آ گئے اور یہی ان کا مسکن بن گیا۔ یکم جنوری ۱۹۸۳ء کو کانپور میں ہی انتقال ہوا اور یہیں مدفون ہیں۔

Bridal bookings
07469245631
@njprofessionalmakeup

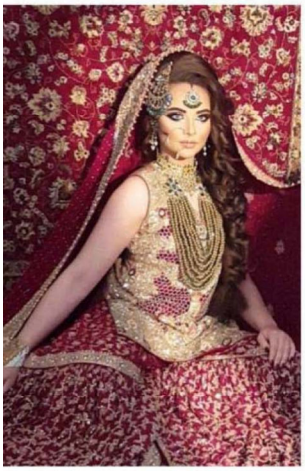

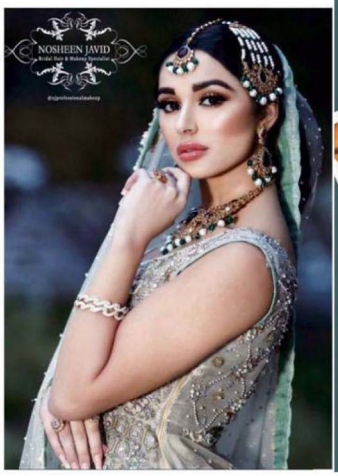

NJ bridal makeup and training academy

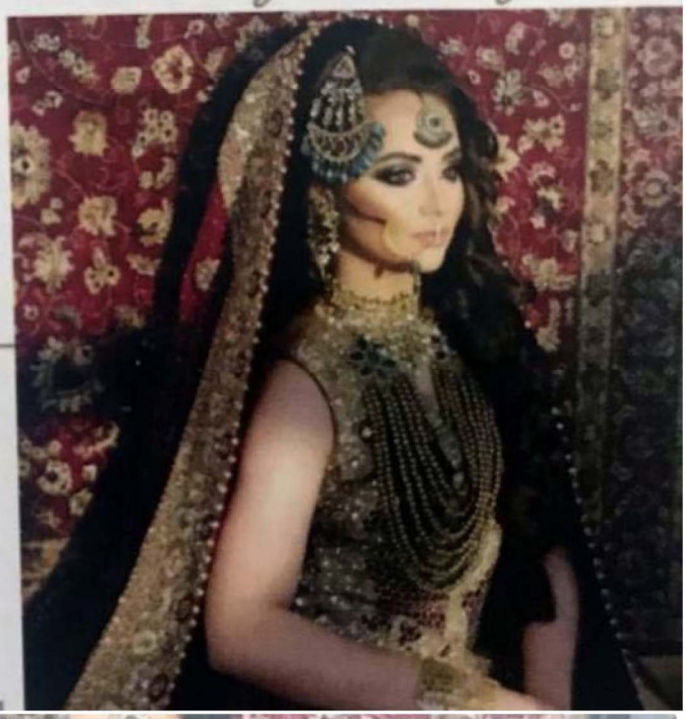

Nosheen Javid
Makeup artist
07469245631
nosheenjavid@yahoo.co.uk
instagram:njprofessionalmakeup

NJ bridal makeup and training academy

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED CHARTERED ACCOUNTANTS
WITH BIG 4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

- ✓ Company incorporation / Registered Office Address
- ✓ Personal Income Tax Return investigations,
- ✓ Rental Income Tax Returns
- ✓ UK State Pension Entitlement Review
- ✓ Advice on filling Gaps in UK State Pension
- ✓ UK State Pension / (Contracted Out) Tracing
- ✓ Private UK Pension Tracing.
- ✓ Assets Review for Inheritance Tax
- ✓ Appealing-Past years HRMC Penalties
- ✓ Preparation / Filing of Prior year tax returns
- ✓ Duplicate-Payslips/ P60s

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

SARMAD KHAN ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD MORDEN SURREY SM4 5HP UK
TEL +44(0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002
E-MAIL: INFO@SARMADGLOBAL.COM
WEB. WWW.SARMADGLOBAL.COM
CELL +44 (0) 7903 416966

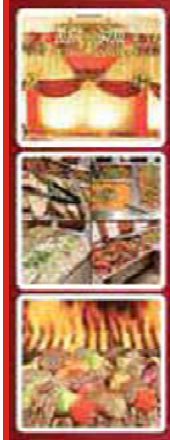

SAAMS FUNCTION HALL
Catering & Event Management

Services Available
- Catering Service
- Special Events
- Corporate Event
- Linen
- Crockery
- Cutlery
- Fresh Flowers
- Drinks
- Stages Decore
- Barbecue Hire

Enquire for a Booking

We Take reservations Everyday

Catering to your requirments
Cell:07883 815195

Under New Management
Newly Refurbished function Hall

SHAHMASKEEN & Co.UK.Ltd

LETTING

SALE

& ALL TYPE OF
BUILDING WORKS

Contact:

S M Shah
+447888683496

Z A Hashmi
+447705982260

shahmaskeen01@gmail.com

SHARIF
JEWELLERS
SINCE 1952

22K GOLD & DIAMOND JEWELLERY
GIA / HRD CERTIFIED DIAMONDS

HUGE SALE

ENJOY UPTO
50% OFF
ON MAKING CHARGES
& NO MAKING ON SELECTED COLLECTIONS*

28 LONDON ROAD, MORDEN SM4 5BQ
+44 20 8075 5777
+44 7888 300 399

*Applicable taxes, terms & conditions apply. Please visit our store for details.

FREE CONSULTATION & LEGAL ADVICE
24 Hours Emergency Numbers

مفت قانونی مشاورت
24 گھنٹے ایمرجنسی سروس

07878 33 5000 / 07774222062

RASHID & RASHID LAW FIRM
211, The Broadway, Southall, UB1 1NB.
Near McDonalds Southall.
Tel: 02085 401 666, Fax 02085 430 534
Email: law786@live.com

190 Merton High Street, Wimbledon
London SW191AX
Tel: 02085 401 666, Fax 02085 430 534
Email: law786@live.com

راشد اینڈ راشد لاء فرم
211، دابراڈوے، ساؤتھ ہال، UB1 1NB نزد میکڈونلڈز ساؤتھ ہال
فون: 02085 401 666، فیکس 02085 430 534
ای میل: law786@live.com

190 میرٹن ہائی سٹریٹ، ویمبلڈن
لندن SW19, 1AX
فون: 02085 401 666، فیکس 02085 430 534
ای میل: law786@live.com

SOW THE SEEDS OF LOVE

Benefit with very competitive rates, tailored advice & service to suit your specific needs, 24 hour response to all online enquiries and our many years of experience
www.rashidandrashid.co.uk

مناسب ریٹس میں آپ کی مخصوص ضروریات کے تحت موزوں مشورہ، 24 گھنٹے آن لائن سروس اور ہمارا سالوں کا تجربہ

- Asylum & Immigration
- New Point Based System
- Settlement Application (ILR)
- European Law
- Nationality & Travel Documents
- Human Rights Applications
- High / Court of Appeals
- Family Matters and Divorce
- Switching Visas
- Over Stayers
- Legacy Cases
- Work Permits
- Visa Extensions
- Judicial Reviews
- Tribunal Appeals
- Student appeals

- اسائلم/سیاسی پناہ اور امیگریشن
- نیا پوائنٹ بیسڈ امیگریشن سسٹم
- ویزا میں تبدیلی
- ویزا توسیع/ایکسٹینشن
- سیٹلمنٹ درخواست (ILR)
- یورپین قانون
- اوور سٹیئرز
- جوڈیشل ریویو
- نیشنیلٹی اور سفری دستاویزات
- درخواست برائے انسانی حقوق/ہیومن رائٹس
- وراثتی معاملات/لیگیسی کیس
- ٹرائبیونل اپیل
- ہائی/کورٹ آف اپیل
- طلاق و دیگر خاندانی معاملات
- ورک پرمٹ
- سٹونٹس اپیل

RASHID & RASHID
Solicitors, Advocates
Immigration Specialists
Commissioners of Oaths

راشد احمد خان
وکیل (پرنسپل)